

دَ اَماد

شوکت مملوئی



داماد

(ناول)

شوکت تھانوی

راہِ گنجِ شمس

C-20۔ جیوٹی کالونی، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔ 110032

بیگم اقبال مٹان

کے نام

جو مٹان کو ”نان من“ کہتی ہیں

اور مٹان ان کو دام اقبالہا سمجھتے ہیں

نام کتاب : داماد (ناول)

مصنف : شوکت تھانوی

سن اشاعت : ۲۰۰۹ء

قیمت عام ایڈیشن : [REDACTED]

قیمت لائبریری ایڈیشن : 110/= روپے

مطبوعہ : فائن آف سیٹ پریس، شاہدرہ، جلی-32

ناشر : راہی کتاب گھر، C-20، جیوٹی کالونی،

لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی-110032

ISBN-81-88645-18-4

DAMAD

By: Shaukat Thanvi

Aam Edition Price [REDACTED]

Library Edition Price : Rs.110/=

Edition : 2009

RAHI KITAB GHAR

C-20, Jyoti Colony, Loni Road,

Shahdara, DELHI-110032

(O)22593249

Sole Distributors:-

KITAB WALA

2794, Gali Jhot Wali,

Pahari Bhojla, DELHI-110006

Ph.: (O)2328 1499, (Mob.)9810277298



- نیر : مسعود یہ صاحب زادی کون تھیں۔
 مسعود : ارے نیر تم؟ اتنی جلدی کیسے آگئیں۔ کیا جلسہ ختم ہو گیا۔
 نیر : ناگوار ہوا ہوگا میرا جلد واپس آ جانا۔ مگر میرے سوال کا جواب دو، یہ تھیں کون بیگم سلاب۔
 مسعود : طلعت تھیں۔
 نیر : طلعت؟ وہ کیا ہوتی ہیں؟
 مسعود : میری خالہ زاد بہن ہے۔ پنڈی سے خالو جان کا تبادلہ لاہور ہو گیا ہے، آج سب پہنچے ہیں۔ لاہور پہنچتے ہی طلعت میرے پاس آئی۔ عجیب سر پھری لڑکی ہے۔ کسی سے اطلاع کرا دیتی تو میں خود پہنچ جاتا۔
 نیر : اب جناب کب پہنچ رہے ہیں اپنی ان خالہ زاد بہن کے یہاں جو لاہور پہنچتے ہی سیدھی آپ کے پاس تشریف لائیں۔
 مسعود : جانا تو چاہیے تھا اس کے ساتھ ہی خالہ جان کے عہلام کو مگر ڈیمیری نیلی فون پر بٹھا گئے ہیں۔ کراچی سے ایک ضروری نیلی فون آنے والا ہے ان کا۔
 نیر : کاش زیدی کو معلوم ہوتا کہ ان کے اس حکم کی تعمیل میں جناب کے کتنے بے تاب جذبات کا خون ہو رہا ہے۔

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام نام، واقعات، کردار، اور مقامات تلافی فرضی ہیں۔ کسی زندہ یا مردہ شخص سے مطابقت محض اتفاقیہ امر ہوگی، جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

مسعود : بے تاب جذبات؟ وہ کیسے؟

نیر : مسعود مجھ کو بے وقوف نہ بتاؤ۔ میں سب کچھ دیکھ چکی ہوں۔ جس ڈالر سے تم اُن صاحب زادی کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے ان کو پہنچانے باہر گئے تھے اور واپسی میں جو چمک اپنی آنکھوں میں لائے تھے وہ میں دیکھ چکی ہوں۔

مسعود : کمال کرتی ہو نیر۔ کہہ تو چکا ہوں کہ وہ میری خالہ زاد بہن ہے۔

نیر : میں خوب جانتی ہوں اِن خالہ زاد اور چچا زاد بہنوں اور بھائیوں کو۔ مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔

مسعود : کیا؟..... کیا برداشت نہیں کر سکتیں۔

نیر : اس قسم کے مناظر جن کا میں ایک ابھی دیکھ چکی ہوں۔

مسعود : پھر وہی۔ آخر تم نے دیکھا کیا ہے۔ اتنے دنوں کی پھڑکی ہوئی بہن جو مجھ کو اپنے زندہ عزیزوں میں سب سے زیادہ عزیز ہے اور جو مجھ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ مجھ سے ملنے آئی۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہوئے۔

نیر : یہی میں برداشت نہیں کر سکتی۔ تم اس کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہو، وہ تم کو سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ یہ برداشت نہیں کر سکتی۔

مسعود : مگر کیوں؟

نیر : تم کو معلوم ہے کہ میں کیوں برداشت نہیں کر سکتی۔

مسعود : اگر مجھ کو معلوم ہوتا تو میں نہ پوچھتا۔

مسعود سچا تھا۔ اس کو واقعی یہ نہ معلوم تھا کہ نیر اس کے لیے کیا جذبات رکھتی ہے اور نیر بھی سچی تھی کہ مسعود کو یقیناً یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس کے باپ کے انتقال کے وقت نیر کے والد نواب ممتاز لد ولد نے یتیم مسعود کے سر پر صرف اس لیے ہاتھ نہ رکھا تھا کہ وہ ان کے مرحوم دوست کی نشانی ہے یا ایک بے آسرا یتیم ہے بلکہ اُن کے پیش نظر اُس وقت بھی اپنی اکلوتی دختر نیر تھی جس کے لیے وہ ایک شوہر خریدنا چاہتے تھے اور داماد پانے کا یہ بہترین موقع تھا کہ ان کو ایک کھرے خاندان کا ایسا بے آسرا بچہ مل رہا تھا جس کو وہ حسب منشا تعلیم دلا کر آسانی سے گھر داماد بنا سکتے تھے۔ چنانچہ وہ مسعود کو اپنے گھر لے آئے اور ہر طرف ان کی فیاضی اور نیک نیتی کی دھوم مچ گئی کہ سبحان اللہ کیا دوستی کا حق ادا کیا ہے، دوست کے یتیم بچے کو کیلجے سے لگا کر لے گئے۔ پھر جب مسعود کے لیے اتالیق اور استاد مقرر ہوئے اور جب مسعود چھوٹے سے پونی پر اعلیٰ درجے کا لباس پہن کر ہوا خوری کو نکلنے لگا تو دیکھنے والوں کو قائل ہونا پڑا کہ یتیم وہ اب نہیں ہوا ہے بلکہ باپ کی زندگی میں یتیم تھا۔ نواب ممتاز لد ولد کی اولوالعزمی مسعود کے لباس، وضع قطع اور تعلیمی اہتمام میں نظر آنے لگی۔ کسی نے کہا نواب صاحب اولاد نہ کا شوق پورا کر رہے ہیں۔ کسی نے کہا یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ کر جنت میں گھر بنا رہے ہیں، حالانکہ وہ صرف بیٹی کا گھر بنانے کے لیے ایک داماد کو پروان چڑھا رہے تھے اور اپنے انتقال کے وقت وہ مطمئن تھے کہ بیٹی کے لیے بہترین لڑکا گھر ہی میں موجود ہے۔

مسعود کی تعلیم اور تربیت جس معیار پر ہوئی، چاہیے تو یہ تھا کہ مسعود رئیس خاندان کی طرح نکما بن کر رہ جاتا جو پڑھتے ضرور ہیں مگر کچھ حاصل کرنے کے لیے

نہیں بلکہ انسانیت سے گزر جانے کے لیے، مگر مسعود بگڑ نہ سکا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ خود نواب صاحب کی اس توجہ میں وہ ڈلا اور لاڈ شامل نہ تھا جو عموماً اولاد کے لیے ہوتا ہے، وہ تو دراصل تجارت کر رہے تھے۔ مسعود کی اس تعلیم اور تربیت کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ ذاتی طور پر تعلیم یافتہ ہو جائے بلکہ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی کا یہ ہونے والا شوہر اس قابل بن جائے کہ اس کو داماد بناتے ہوئے ان کو یہ محسوس نہ ہو کہ اپنی بلندی سے مجبوراً کسی پستی کی طرف جھکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ داماد تو ایسی چیز نہیں کہ کسی کمپنی میں آرڈر دے کر حسب فضاء بنوایا جاسکے کہ یہ تعلیم ہو، یہ عادات ہوں، یہ وضع قطع ہو، اس قسم کا مزاج ہو اور یہ افتادِ طبیعت ہو، مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ دولت سے سب ہی کچھ خریداجا سکتا ہے۔ نواب ممتاز لدو کو قسمت سے یہ موقع بھی مل گیا کہ اپنی مرضی کے عین مطابق داماد بنواسکیں۔ چنانچہ وہ مسعود کو اپنی دامادی کے قابل بنانے میں شب و روز مصروف رہے اور آخر وہ دن بھی آیا کہ مسعود امتیاز کے ساتھ گرجوئیٹ ہو گیا۔

یہ تو سب کچھ درست ہے مگر مسعود کو آج پہلی مرتبہ نیر نے یہ کہہ کر حیران کیا تھا کہ وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتی کہ مسعود اپنی خالہ زاد بہن طلعت سے ملے۔ اُس طلعت سے جس کے نقوش اس کے دل و دماغ پر اتنے گہرے تھے کہ بچپن کی یادیں عمر کے ساتھ اب جوان ہو چکی تھیں۔ وہ بھولی بھالی معصوم سی بچی طلعت جو اب تک اس کے خوابوں میں بسنے والی مخلوق تھی اب اس کی تعبیر کی دنیا میں ایک جیتی جاگتی حقیقت بن کر سامنے آ چکی تھی۔ اور وہ لاہور پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کے پاس پہنچی۔ اس کی آنکھوں میں مسعود کے لیے جو چیز بچپن میں تھی وہی چیز اب جوان ہو چکی تھی۔ بچپن میں اس چیز کا کوئی نام نہ تھا مگر اب اس کو کشش کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ تو سب کچھ درست ہے مگر مسعود حیران تھا کہ نیر یہ برداشت کیوں

نہیں کر سکتی اور نیر اس وقت اس طرح بھری ہوئی اس کے سامنے کھڑی تھی کہ باوجود نیر کی ضدی طبیعت اور چڑچڑے مزاج کا اندازہ ہونے کے مسعود حیران تھا کہ یہ کیفیت جو آج نظر آ رہی ہے قطعاً نئی ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ نیر کو کن الفاظ میں سمجھائے اور سمجھائے بھی تو کس طرح سمجھائے۔ آخر نیر نے خود کہا۔

نیر : میں آپ کو اس قدر معصوم نہیں سمجھتی کہ آپ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ میں یہ کیوں برداشت نہیں کر سکتی۔

مسعود : یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ میں برداشت کی قوت ایک سرے سے ہے ہی نہیں مگر یہاں یہ سوال ہی کیسے پیدا ہوا۔

نیر : یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ آپ کو اس لڑکی سے دل چسپی ہے۔

مسعود : یقیناً ہے اور ہونی ہی چاہیے۔ میں آپ کو نہیں سمجھا سکتا کہ طلعت میرے لیے کیا ہے۔

نیر : مگر یہ بات آپ کو پہلے ہی بتا دینی چاہیے تھی۔

مسعود : یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں وہ اکثر یہاں آئی ہے۔ صرف اس مرتبہ میں اس سے چار سال بعد ملا ہوں اس لیے کہ میں یہاں تھا ہی نہیں، تعلیمی سلسلے میں باہر رہا۔

نیر : چار سال پہلے جن بے تکلفیوں کو بچپن کہہ کر ٹالا جاسکتا تھا وہی باتیں اب معنی خیز بن چکی ہیں۔

مسعود : کیا معنی خیز بن گئی ہیں، یہی ناکہ میں اس کو واقعی بہت عزیز رکھتا ہوں۔

نیر : مگر اس کا آپ کو کوئی حق نہیں۔

مسعود : مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ میرا یہ حق بھی چھن چکا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ کو اس کا حق کیوں نہیں ہے۔

نیر : آپ پوچھنا ہی چاہتے ہیں اور جان بوجھ کر پوچھنا چاہتے ہیں تو سنیے۔
آپ کو یہ حق اس لیے نہیں ہے کہ آپ کے اس التفات کی مستحق میں اور
صرف میں ہوں۔

مسعود : آپ؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔

نیر : میں نے غالباً کسی ایسی زبان میں بات نہیں کی ہے جس سے آپ
واقف نہ ہوں۔

مسعود : مگر میں نے اس نقطہ نظر سے آپ کو پڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

نیر : حالانکہ سوائے اس کے اور کوئی نقطہ نظر ہی نہ تھا۔

مسعود : جی نہیں، سب سے بڑا نقطہ نظر یہ تھا کہ آپ میری محسن زاوی ہیں۔

میرے دل میں آپ کی عزت ہمیشہ اس لیے رہی کہ آپ اس شریف
الفس فیض اور اولوالعزم بزرگ کی بیٹی ہیں جس نے مجھ یتیم کے سر پر

ہاتھ رکھا اور باپ سے زیادہ شفقت کے ساتھ مجھے پالا۔ وہ بزرگ جس
کی موت نے مجھ کو صحیح معنوں میں یتیم کر دیا مگر میں نے کبھی یہ خیال بھی

اپنے دل میں نہ آنے دیا کہ تم یہ سمجھ بیٹھو گی۔ مجھ کو ابا جان کے انتقال کے
بعد سے تمہاری فکر تھی کہ بڑا بھائی بن کر تمہاری شادی کسی ایسی جگہ کروں

کہ ابا جان کی روح کو سکون حاصل ہو۔ زیدی کا انتخاب اسی نقطہ نظر
سے کیا تھا۔

نیر : (جھنجھکی کر) مسعود! را کے لیے پُپ رہو۔ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ زیدی کو
تم اس لیے یہاں لائے ہو۔ میں اس کو صرف تمہارا دوست سمجھ کر انگیز کر

رہی تھی۔ اور اب اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔

مسعود : تم کو اپنے گھر پر پورا اختیار حاصل ہے نیر۔ مگر میں تو تمہاری آج کی

باتیں سن کر حیران رہ گیا ہوں۔

نیر : اور میں حیران ہوں کہ اب تک تم یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ ابا جان کی تم کو

یہاں لانے، تم کو اس دل سوزی سے پڑھانے، تم کو اس محبت سے
پردان چڑھانے میں نیت کیا تھی۔ یہ تو کوئی ایسی پیچیدہ بات نہ تھی کہ تم

اس کو کبھی سمجھ ہی نہ سکے۔

مسعود : نیت کا علم صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔ مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ بغیر کسی خاص
نیت کے محض نیک نیتی ہو مرحوم کی۔

نیر : نیت کا علم بے شک خدا کو ہوتا ہے۔ مگر میں نے آج جو کچھ کہا ہے یہ

احساس خود ابا جان ہی نے پیدا کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ تمہارا ذکر اسی انداز
سے کرتے تھے کہ میرے ذہن میں یہ خیال یقین بننا گیا کہ میرا اور

تمہارا جوگ ایک طے شدہ بات ہے۔

مسعود : کاش تمہارے اس احساس کا مجھے پہلے سے علم ہوتا اور میں اس غلط فہمی کو
اب سے بہت پہلے رفع کر سکتا۔

نیر : تو گویا یہ غلط فہمی ہے۔

مسعود : یقیناً غلط فہمی ہے اس لیے کہ میں نے تم کو ہمیشہ اپنی بہن سمجھا ہے اور اس

کے علاوہ میں اب بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابا جان مرحوم کی شفقت کے معنی
یہ نہیں کہ میں نے ان کے ناز و نعم میں اپنی حقیقت ہی بھلا دی ہے، میں

ایک غریب باپ کا غریب بیٹا ہوں۔ خوش قسمت تھا کہ نواب
ممتاز ولد ایسا بزرگ میرے لیے رحمت کا فرشتہ بنا اور مجھ کو تعلیمی

مواقع حاصل ہو گئے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ میں گویا خرید گیا
تھا اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا تھا کہ میں ان کا داماد بنوں گا۔ مجھ کو ابا

جان مرحوم پر یہ خیال ہی تہمت معلوم ہوتا ہے۔

میری جب کبھی کہیں سے نسبت آئی، ابا جان نے یہی کہا کہ لڑکا گھر میں موجود ہے۔

کاش کبھی میرے سامنے کہا ہوتا اور میں ان کو یقین دلا سکتا کہ غریب رہنا جرم نہیں مگر غریب کا ایک جانا جرم ہے۔

اس میں غربت اور امارت کا کیا سوال ہے مسعود۔

یقیناً سوال ہے اس لیے کہ یہی دو جیتی جاگتی حقیقتیں ہیں۔

خاک حقیقتیں ہیں۔ مجھ سے دامن بچانے اور اپنی خلعت کے لیے اپنے کو آزاد کرنے کے سب بہانے ہیں۔ اگر تم کو میری پروا نہیں تو مجھ کو بھی تمھاری پروا کیوں ہو۔ یہ تو صرف ابا جان کی خوشی تھی ورنہ میں ایسی گری پڑی بھی نہیں کہ خواہ خواہ اپنے کو کسی کے سرمنڈھتی رہوں۔

مجھ کو غلط نہ سمجھو نیر۔

اب کیا غلط سمجھوں گی۔ مدتوں غلط سمجھتی رہی۔

تمھارے لیے زیدی کے انتخاب میں میری پوری نیک نیتی شامل ہے۔

جناب کا شکریہ۔ مجھ کو نہ جناب کی ضرورت ہے اور نہ اُس بے وقوف

سوداگر بچے کی۔ میرا باپ میرے لیے اتنا چھوڑ گیا ہے کہ میں اپنے

روپے سے زیدی سے زیادہ اچھے قسم کے جانور خرید کر سدھا سکتی ہوں۔

تو گویا یہ تمھارا اعلیٰ فیصلہ ہے کہ تم کو میری بھی ضرورت نہیں۔

بحیثیت سرپرست کے مجھ کو تمھاری بھی ضرورت نہیں۔

اچھا اگر کبھی ضرورت پیش آجائے تو محض اپنی ضد کی وجہ سے تکلف نہ

کرتا۔ میں تمھارے بزرگ والد کا احسان مند ہوں اور یہ احسان کبھی نہ

بھولوں گا۔ خدا حافظ۔

مسعود نہایت اطمینان سے اٹھا اور باوجود ایسی اہم انقلابی گفتگو کے وہ صبر و سکون کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ نیر نے اس کو جاتے ہوئے دیکھا اور جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا تو نیر نے دانت پس کر کہا۔ ”احسان فراموش، ابن الوقت“ اور جب وہ اپنے کمرے سے نکل کر باہر گیا اس وقت نیر ایک زخم خوردہ شیرنی کی طرح پہلے تو پھری ہوئی کھڑی رہی پھر چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھا کر اپنی خواب گاہ تک گئی اور مسعود کی وہ تصویر جو اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر ایک چاندی کے فریم میں رکھی ہوئی تھی اٹھا کر اس طرح پھینکی کہ چکنا چور شے کی اوٹ میں مسعود کا جسم دکھ کر وہ ضبط نہ کر سکی اور روتی ہوئی اپنی مسہری پر گری اور اپنی سکیوں میں ڈوب گئی۔ معلوم نہیں یہ گریہ بھی اس کے اشتعال کا کوئی پرتو تھا یا وہ دراصل اس وقت عورت تھی، وہ عورت جس کی آخری پناہ اس کے آنسو ہوتے ہیں۔ دیر تک وہ اپنے تکیوں میں سر دے ہوئے سسکیاں لیتی رہی، آخر سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اٹھی۔ ٹوٹی ہوئی تصویر اٹھائی اور اس کو ایک دوسرے فریم میں لگا کر اُسی جگہ رکھ دیا جہاں وہ پہلے تھی۔ خدا ہی جانے اتنی ہی دیر میں اُس پر یہ متضاد کیفیتیں کیوں گزر گئیں اور ان کا مفہوم کیا تھا۔ مگر آنکھوں میں آنسو اُس وقت بھی تھے جب تصویر پھینکی تھی اور آنکھوں میں آنسو اُس وقت بھی تھے جب تصویر اٹھائی ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے اے عورت تیرے آنسوؤں کی شرح کسی اور سے تو کیا خود تجھ سے بھی ممکن نہیں۔



نیر کے وہ آنسو جو نہ جانے اس کے مشتعل دل کے لاوے کی حیثیت رکھتے تھے یا ایک عورت کی شکست کا اعتراف تھے ابھی جاری ہی تھے کہ باہر سے ان بیہودہ اور مہمل قہقہوں کی آواز آئی جس سے وہ ایک مرتبہ سہم کر کھڑی ہو گئی اور اپنے کو اس تازہ مصیبت کے لیے تیار کرتے ہوئے اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھے اور آئینہ کے سامنے جا کر اپنے اُلجھے ہوئے بالوں کو تو برش سے جلدی جلدی ٹھیک کر لیا مگر ان سوجی ہوئی آنکھوں کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زیدی ایسے ناجنس کے سامنے وہ اپنا اور مسعود کا دکھڑا لے کر بیٹھے بلکہ وہ تو یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح بغیر کچھ سمجھے ہوئے زیدی اگر دفعان ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ وہ یوں ہی زیدی کو یہ مشکل برداشت کرتی تھی اور اگر مسعود کا خیال نہ ہوتا تو وہ ان حضرات کو کبھی منہ نہ لگاتی۔ مختصر یہ کہ وہ ان کو مسعود کا دوست سمجھ کر انگیز کر رہی تھی اور باوجود سمجھنے کی کوشش کے کبھی نہ سمجھ سکی کہ مسعود اور زیدی دو متضاد شخصیتوں میں دوستی کا سوال آخر کس حادثے کے ماتحت پیدا ہوا ہوگا اور فرض کیجیے کہ بہت سی عجیب و غریب باتوں کی طرح یہ عجیب بات بھی ظہور میں آگئی ہے تو آخر یہ مہمل دوستی نہایت کیوں جاری ہے۔ مگر اب تو نیر کو معلوم ہو چکا تھا کہ زیدی کس تقریب میں یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد ان کا ہر تصور اور ان سے متعلق ہر خیال نیر کے

احساس پر ایک نہایت ناگوار بوجھ کی حیثیت رکھتا تھا، مگر سوال یہ تھا کہ وہ آخر اس مصیبت سے کیوں کر چھٹکارا حاصل کرے اور کن الفاظ میں اس سے کہے کہ جو خواب وہ دیکھ رہا ہے وہ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ زیدی کو اب تک تو صرف ناجنس ہی سمجھتی تھی مگر آج تو اس کو زیدی اپنی ایک ایسی بیماری محسوس ہو رہا تھا جس سے نجات پانے کے لیے مریض دعا کے طور پر بد دعا بھی کر سکتا ہے اور صحت کے بجائے موت مانگ سکتا ہے۔

نیر ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ زیدی اپنی عادت کے مطابق بغیر اجازت لیے اس کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ زیدی نے ایک احمقانہ قہقہہ لگا کر کہا۔ ”یعنی آپ یہاں ہیں اور میں نے سارا گھر چھان مارا کہ کہیں تو آپ ملیں۔ میرا ٹیلی فون تو نہیں آیا۔“

نیر نے بے رخی سے کہا۔ ”جی نہیں کوئی نہیں۔“

زیدی : نہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

نیر : تو گویا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ ہوا ایسے سکتا ہے کہ یہی ہوا۔

زیدی : نہ۔ نہ۔ یہ مطلب نہیں ہے میرا۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ ضرور آنا چاہیے تھا۔ بڑا اہم کاروباری معاملہ ہے جس کے لیے میں نے ٹرک کال کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ کراچی کے بازار کا بھاؤ جب تک نہ معلوم ہو.....

نیر : (بات کاٹ کر) زیدی صاحب مجھ کو آپ کے کاروباری معاملات سے کوئی دل چسپی نہیں۔

زیدی : وہ تو درست ہے مگر بات یہ ہے کہ جب تک کراچی کے بازار کا بھاؤ نہ معلوم ہو میں لاہور میں کسی گاہک سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔

نیر : تو نہ کیجیے۔ مجھے آپ خواہ مخواہ سمجھا رہے ہیں یہ لغو باتیں۔

زیدی : جی میں سمجھا نہیں رہا ہوں مگر قصہ دراصل یہ ہے کہ صاحب مجھے تو حیرت ہوگئی یہاں کے کپڑے کے بازار کا رنگ دیکھ کر۔ اب مثلاً آپ جس کپڑے کی ساری باندھے ہوئے ہیں اس کی گانٹھ کی قیمت کا اندازہ آپ کے نزدیک کیا ہو سکتا ہے۔

نیر : نہ مجھے کوئی اندازہ ہے نہ میں اندازہ کرنا چاہتی ہوں۔

زیدی : وجہ یہ ہے کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ یہاں کی اور کراچی کی قیمتوں میں کتنا فرق ہے۔ مگر صاحب تعجب ہے کہ ٹیلی فون نہیں آیا۔ اگر آج ٹھیک وقت پر بھاؤ معلوم ہو جاتا تو کم سے کم ایک لاکھ چوبیس ہزار کا سودا تو میں چٹکی بجاتے کر لیتا اور اس کے بعد۔

نیر : زیدی صاحب میں آپ سے عرض کر چکی ہوں کہ مجھے آپ کی ان بیوپار والی باتوں سے کوئی دل چسپی نہیں۔ آپ خواہ مخواہ میرے دماغ میں ہتھوڑے چلا رہے ہیں۔

زیدی : (قتبہ لگا کر) خوب صاحب خوب۔ یہ بزنس کی باتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ مسعود بھی ان باتوں سے بہت الجھتے ہیں۔ اور یہ حضرت ہیں کہاں غائب؟

نیر : وہ تشریف لے گئے۔

زیدی : ان کی تشریف کا بھی عجیب عالم ہے۔ قرار تو ہے ہی نہیں بندہ خدا کو۔ اور صاحب میں تو حیران یہ ہوں کہ اتنا سمجھ دار آدمی ہو کر معلوم نہیں بزنس سے کیوں گھبراتا ہے۔ میں نے کہا کہ بھیا اپورٹ اکسپورٹ.....

نیر : جہنم میں گیا آپ کا اپورٹ اکسپورٹ، میں کچھ سننا نہیں چاہتی کہ آپ نے ان سے کیا کہا اور انھوں نے آپ سے کیا سنا۔

زیدی : وہ تو درست ہے مگر میرے ناقص خیال میں تو ملازمت سے زیادہ بزنس میں مزے کریں گے۔ اب مجھ کو دیکھ لیجیے کہ کراچی کے ایک فٹ پاتھ پر کٹ پیس کی دوکان کھولی تھی میں نے۔ اُسی میں اللہ تعالیٰ نے ایسی برکت دی کہ.....

نیر : اللہ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے کس قدر متلی ہو رہی ہے آپ کی ان باتوں سے۔

زیدی : اس کی وجہ تو یہ ہے تاکہ آپ نے کاروباری دماغ نہیں پایا۔

نیر : میں نے جیسا کچھ دماغ پایا ہے۔ اس کو نوش فرمانے کا آپ کو کوئی حق نہیں اور اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ سے بات ہی نہ کروں تو میرا اس کے لیے بھی تیار ہوں۔

نیر تو بے زاری کے ساتھ چلی گئی مگر زیدی کی سمجھ میں واقعی کچھ نہ آیا کہ وہ اس قدر بے زار کیوں ہے بلکہ اس کی بے زاری کو خاطر میں لانے کے بجائے وہ اسی فکر میں مبتلا رہا کہ آخر کراچی سے ٹیلی فون کیوں نہیں آیا اور اگر ٹیلی فون نہ آیا تو اس کے کاروبار پر کیا اثر پڑے گا۔ نیر اُس وقت جس کیفیت میں مبتلا تھی اس کا اندازہ کر لینا کوئی مشکل بات نہ تھی مگر زیدی ان لطیف احساسات کا نہ عادی تھا نہ اس قسم کے لوگ احساس اور جذبات قسم کے طوطے پالتے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے سپاٹ قسم کے بیوپاری کو نیر کے لیے منتخب کرنے میں مسعود کی آخر مصلحت کیا تھی۔ یہ تو ناممکن ہے کہ مسعود کو نیر کی افتاد طبیعت کا علم ہی نہ ہو اور یہ بھی درست نہیں کہ زیدی سے مسعود واقف نہ ہو۔ اس اجتماعِ ضدین کے متعلق بہت کچھ غور کرنے کے بعد صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ مسعود نے جان بوجھ کر نیر کے لیے زیدی کا انتخاب صرف اس لیے کیا تھا کہ نیر کی سی ضدی اور بر خود غلط خاتون کا

نباہ اگر کسی کے ساتھ ہو سکتا ہے تو صرف زیدی کی قسم کے عقل سے خارج اور دولت سے بھرپور نوجوان کے ساتھ ہو سکتا ہے جو نیر کی ہر جائز و ناجائز خواہش کے سامنے سر جھکا سکتا ہے اور جس کو یہ جستجو کبھی نہیں ہو سکتی کہ آخر ان خاتون محترم کا کس بات سے مطلب کیا ہے۔

میسود چانتا تھا کہ دولت مند باپ کی اس اکلوتی بیٹی کے مزاج میں کس حد تک نکون ہے۔ کسی مسئلے کے متعلق اس کی رائے ابھی کچھ ہے اور ابھی کچھ پھر یہ کہ وہ حکومت کے خناس میں اس بُری طرح جلتا تھی کہ شادی کے بعد ہر قسم کے شوہر سے تصادم یعنی تھا سوائے اس شوہر کے جو مرعوب ہو کر اپنے تمام اختیارات اُسی کو سونپ کر خود رعایا بن کر رہ جائے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نیر کے دل میں کسی ایسے شخص کے لیے عزت کا پیدا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا جو مالی اعتبار سے اس کے مقابلے کا نہ ہو۔ یہ تھے وہ اعتبار اور وہ معیار جن پر زیدی پورا اُترتا تھا۔ عقل کی کمی دولت کی زیادتی، ہمت مفقود، زن مریدی کی صلاحیت موجود، انہی شخصیت سے بے خبر اور ہر اعتبار سے بے اثر۔ اب اسی وقت دیکھ لیجیے کہ نیر نے ہر ممکن کوشش کر لی کہ وہ اس تحقیر کا اندازہ کر لیں جو ان کے لیے اس کے ہر انداز میں تھی مگر وہ عقل کے ایسے جیم کہ اپنی ہی دھن میں گن رہے یہاں تک کہ جب نیر بے زار ہو کر چلی گئی تو تھوڑی دیر کے بعد آپ پھر بن سنور کر اس کو ڈھونڈتے ہوئے کوفی کے باغ میں جا پہنچے جہاں وہ ان حضرت سے پناہ لینے کے لیے گئی تھی اور جاتے ہی پھر وہی بے معنی قہقہے۔

زیدی : (قہقہہ بلند کر کے) خوب صاحب خوب۔ تو گویا آپ گل گشت چمن میں مصروف ہیں۔ کیا رائے ہے آپ کی اس سوٹ کے متعلق۔ صاحب لطیفہ نہ ہوا کہ سوٹ تو میں نے بڑے چاؤ سے سلوا لیا مگر آپ اس کے

ساتھ کی ٹائی کہاں سے آئے۔ بہت ڈھونڈی، کراچی، لاہور، راولپنڈی۔ آخر کترن بھیجتا پڑی ولایت اور یہ ٹائی منگائی۔ کیا خیال ہے آپ کا اس ٹائی کے متعلق؟

نیر

زیدی صاحب میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ اس قسم کی باتیں تو خیر عموماً کرتے ہی ہیں مگر کبھی کوئی معقول بات بھی کرتے ہیں۔

زیدی

:(قہقہہ لگا کر) خوب صاحب خوب۔ بڑی اچھی بات کہی آپ نے۔ مگر جناب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس سوٹ پر تقریباً.....

نیر

:(غصے سے) جہنم میں گیا آپ کا سوٹ۔ مجھے نہ آپ کے سوٹ سے کوئی دل چسپی ہے نہ آپ کی ٹائی سے۔

زیدی

:(یہ تو درست ہے۔ واقعی کسی کا لباس کیا دیکھنا۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ اس لباس میں جو انسان ہے وہ کیسا ہے۔

نیر

:(جی ہاں میں اس انسان کو بھی دیکھ چکی ہوں اور وہ انسان بھی میری سمجھ میں نہ آیا ہے نہ میں سمجھنا چاہتی ہوں۔

زیدی

:(یہ آپ نے بڑی عمدہ بات کہی۔ بخدا میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ موجود ہیں، یہ بات میں اکثر دوستوں سے بھی کہہ چکا ہوں کہ باوجود آزار اور خود مختار ہونے کے آپ کو میں نے بہت محتاط پایا ہے۔

نیر

:(کیا مطلب ہے آپ کا محتاط سے؟

زیدی

:(میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے آپ کو کبھی کسی کی طرف متوجہ نہیں پایا۔ خواہ کوئی کیسا ہی دولت مند ہو۔ کتنا ہی خوب صورت اور خوش وضع ہو۔

نیر

:(یہ کس قسم کی سڑی ہوئی باتیں آپ کر رہے ہیں۔ آپ کو اپنے متعلق آخر

غلط فہمی کیا ہے۔

زیدی : غلط فہمی تو خیر کیا ہوتی۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ باپ کا سایہ سر پر نہیں ہے۔ دولت ہے، فراغت ہے۔ سب کچھ ہے مگر کیا مجال کہ نگاہ ذرا بھی نیچے اور قدم میں کوئی لغزش پیدا ہو۔ دراصل میں یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا اور آج پہلی مرتبہ عرض کر رہا ہوں کہ اب میں بالکل مطمئن ہوں۔

نیر : کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ جناب کے اطمینان سے مجھے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

زیدی : فائدہ تو خیر کیا ہوتا مگر مجھے یہ اطمینان واقعی ہو گیا ہے کہ میں کوئی اندھا بھلا نہیں کھیل رہا ہوں۔

نیر : زیدی صاحب۔ ادھر دیکھیے۔ آپ کو جس خوش فہمی میں مسعود صاحب نے مبتلا کر رکھا ہے وہ غلط ہے۔ مجھے آج پہلی مرتبہ یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ کیا خواب دیکھ رہے ہیں۔ مگر کان کھول کر سن لیجیے میری اور آپ کی افتادِ طبیعت میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

زیدی : کوشش کروں گا یہ فرق باقی نہ رہے۔

نیر : آپ بے کار یہ زحمت فرمائیں گے۔ آپ میرے معیار پر کبھی پورے نہ اتریں گے۔

زیدی : خیر یہ تو آپ قبل از وقت فرما رہی ہیں۔ مجھ میں یہی تو ایک خوبی ہے کہ میں اپنے کو ہر ماحول کے مطابق بنا سکتا ہوں۔ کراچی کا ایک قصہ سناؤں آپ کو۔

نیر : زیدی صاحب کوئی صورت ایسی نہیں ہو سکتی کہ آپ مجھے بخش دیں۔

زیدی : جی نہیں وہ جو آپ نے فرمایا ہے کہ میں معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔

کراچی میں بھی ایک مرتبہ یہی ہوا کہ.....

نیر : سنیے زیدی صاحب، نہ میرا دماغ اس قابل ہے کہ آپ سے کھپاؤں نہ مجھے آپ کے کسی کراچی کے قصے سے کوئی دل چسپی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے ایسے آدمی سے کوئی کس قسم کی بات کرے۔ میں آپ سے صاف صاف کہہ چکی ہوں کہ جو خیال آپ کے ذہن میں ہے اس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

زیدی : فی الحال نہ سہی مگر ممکن ہے پیدا ہو جائے۔

نیر : جی نہیں۔ قیامت تک یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ اب آپ صاف صاف سننا چاہتے ہیں تو سنئے کہ میں آپ کے ایسے آدمی کو دوست کی حیثیت سے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ مسعود کے دوست کی حیثیت سے یہاں تھے مگر اب جب کہ مسعود بھی یہاں سے جا چکے ہیں۔

زیدی : یہاں سے جا چکے ہیں؟ کیا مطلب۔

نیر : مطلب وہی ہے جو اس سادہ جملے کا ہونا چاہیے کہ مسعود یہاں سے جا چکے ہیں۔

زیدی : وہ تو سمجھ گیا مگر کیوں؟

نیر : یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا تھا کہ آپ کے دوست یہاں سے جا چکے ہیں۔ مجھے آپ کی دوستی کا شرف نہ حاصل ہے نہ میں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ پھر آپ کا یہاں قیام فرمانا غالباً آپ کے نزدیک بھی مناسب نہ ہوگا۔

زیدی : جی نہیں میں تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔

نیر : آپ مجھے دیوانہ کر دیں گے۔ آپ کیوں مجھے بد اخلاقی اور بد تمیزی پر

مجبور کر رہے ہیں۔ آخر میں آپ سے کن الفاظ میں کہوں کہ میں نہیں چاہتی کہ آپ ان حالات میں یہاں رہیں۔

زیدی : یہ تو درست ہے مگر اس طرح تو میرے کاروبار پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ میں نے اپنے تمام بیوپاریوں اور تمام گاہکوں کو آپ ہی کا ٹیلی فون نمبر بتایا ہے۔ ڈاک خانہ کو یہی ہدایت ہے کہ میری تمام کاروباری ڈاک اسی پتے پر آئے۔

نیر : تو کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں کسی ہوٹل میں اٹھ جاؤں۔ کوئی مکان کرایہ پر لے لوں، آخر کہاں دفعتان ہو جاؤں۔

زیدی : یہ تو خیر میں کہہ ہی نہیں سکتا۔ مگر یہ درخواست کروں گا کہ فی الحال ایک طرف پڑا رہنے دیجئے جب تک میں کوئی اور انتظام نہ کر لوں۔

نیر : جب تک آپ انتظام نہ کر سکیں آپ شوق سے رہ سکتے ہیں۔

زیدی : جی ہاں ممکن ہے اس عرصہ میں آپ کی رائے بدل سکوں۔

نیر : پھر آپ نے وہی مہمل بات کہی۔ زیدی صاحب رائے وہ بدل سکتی ہے جو پہلے قائم کی گئی ہو، میں تو آپ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ہی نہیں چاہتی اور نہ آپ کو یہ حق دیتی ہوں کہ آپ آئندہ اس قسم کی کوئی بات مجھ سے کہی کریں۔

اس قسم کے چکنے گھڑے عام نہ سہی مگر ان سے دنیا خالی نہیں۔ نیر لاکھ خنک اور منہ پھٹ قسم کی لڑکی سہی مگر اس کو زیدی نے کچھ ضرورت سے زیادہ صاف گوئی اور بد اخلاقی پر مجبور کیا۔ اس کے باوجود وہ زیدی کے پاس سے اس قدر بور ہو کر واپس آئی کہ در دسریں ایک مٹت کئی گولیاں کھا کر گرم چائے کی تلے اوپر کئی پیالیاں اسے چینا پڑیں، مگر زیدی نے یہ احسان ضرور کیا کہ وہ جو مسعود کے جانے کا ایک شدید اثر

اُس پر تھا وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے غیر محسوس طور پر پس منظر میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔ اسے زیدی کے تاجس ہونے کا علم تھا۔ وہ زیدی کو ایک بد مذاق بیوپاری بھی جانتی تھی، اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ زیدی ایک اعلیٰ درجے کا بد مذاق اور بھونڈا آدمی ہے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ حضرت اس پائے کے بے حسے بھی ہیں اور اب تو اسے زیدی کے تصور سے ڈر لگنے لگا تھا۔ مگر زیدی اس کو صرف ایک وقتی بات سمجھ کر زیادہ سے زیادہ اس نتیجے پر پہنچے کہ غالباً مسعود سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہے اور چوں کہ ان صاحب زادی کا دھوبی سے بس نہیں چلا ہے لہذا گدھے کے کان اٹھتے گئے ہیں۔ کچھ دیر تو وہ گرم سم سے بیٹھے رہے مگر آخر اخلاقی قدریں دل و دماغ میں انگڑائیاں لینے لگیں کہ ایسی بھی کیا بے مروتی، یہی وقت تو ہے کہ اس بے چاری کی دل دہی کی جائے اور اس کے ٹوٹے ہوئے دل کی تسکین کے امکان پیدا کئے جائیں۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا مگر ہمت نہ ہوئی، ہر مرتبہ نیر کے گڑے ہوئے تیور سامنے آ گئے۔ لیکن جب وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اس بے زاری کی وجہ دراصل وہ خود نہیں بلکہ مسعود معلوم ہوتے ہیں تو دل پھر طواف کوئے ملامت کے لیے چلا اور آپ نے نیر کے کمرے میں داخل ہو کر یہ انداز اختیار کیا گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

زیدی : ارے ابھی نیر صلبہ۔ میں نے کہا.....

نیر : اُف میرے خدا۔ آپ پھر آ گئے۔

زیدی : وہ تو آتا ہی پڑا مجبوراً۔ بات یہ ہے کہ جس احمق کی حماقت کا آپ اتنا اثر لیے ہوئے ہیں میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

نیر : آپ کی اس معلومات کا شکریہ۔ مگر میں صرف یہ عرض کر دوں کہ میرے سر میں شدید درد ہے۔

زیدی : سر میں درد ہے؟ بس اتنی سی بات۔ ذرا زبان دکھائیے۔

نیر : میں علاج نہیں ہمدردی چاہتی ہوں۔ اور وہ بھی صرف اس قدر کہ آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔

زیدی : یعنی آپ اتنی سمجھ دار اور عقل مند ہو کر ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ مسعود کو میں سر کے بل لاؤں گا، وہ ناک رگڑے گا آپ کے سامنے ناک سے لیکریں کھینچے گا۔

نیر : زیدی صاحب مجھے ان میں سے کسی بات کی ضرورت نہیں۔ صرف سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔

زیدی : میں یہی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کو سکون حاصل ہو سکے مگر کم سے کم یہ تو بتائیے کہ اُس عقل کے دشمن نے آخر کیا کیا اور وہ بندہ خدا گیا کہاں۔

نیر : زیدی صاحب اللہ مجھ پر رحم کیجیے۔ مجھے آپ کی کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔

زیدی : آپ کو ضرورت نہ سہی مگر میرا بھی تو آخر کوئی فرض ہے۔

نیر : آپ کیوں مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں تنگ آ کر آپ سے یہ کہہ دوں کہ میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی۔

زیدی : مجھے معلوم ہے کہ غصے میں آدمی سب کچھ کہہ سکتا ہے اور میں غصے کی بات پر برائیاں نہیں مان سکتا۔

نیر : خدا کے لیے آپ مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجیے جس سے آپ بُرا مان سکتے ہوں۔ میں آپ کو ناراض کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ

آپ مجھ سے اس قدر ناراض ہو جائیں کہ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے اس قدر خفا ہو جائیں کہ مجھے کبھی معاف نہ کریں، مجھ سے بے زار ہو جائیں۔ کسی طرح تو میری جان

بچے۔ خدا کے لیے ناراض ہو جائیے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں خفا ہو جائیے۔

زیدی : آپ مجھ کو غلط سمجھی ہیں نیر صاحبہ۔ بخدا میں آپ کی کسی بات سے ناراض نہیں ہو سکتا۔

نیر : کاش آپ یہ احسان کر سکتے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ آپ چکنے گھڑے کی کون سی قسم ہیں۔

زیدی : بھی خوب بات کہی۔ اچھا اب مجھ کو صرف یہ بتا دیجیے کہ مسعود آخر گیا کہاں ہے۔

نیر : مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے، اس کے علاوہ کچھ نہیں معلوم۔

زیدی : ہمیشہ کے لیے تو خیر کیا..... مگر جیب بے ہودہ آدمی ہے۔ کم سے کم میرا تو انتظار کر لیا ہوتا۔

نیر : اچھا زیدی صاحب اب مجھ کو کم سے کم تھوڑی دیر خاموش پڑا رہنے دیجیے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے تنہا چھوڑ دیجیے۔

زیدی : بہت بہتر، آپ آرام فرمائیے میں جب تک پتہ چلاتا ہوں کہ یہ جانور آخر گیا کہاں۔

نیر تو نیر ان حالات میں کوئی بھی ہوتا تو زیدی سے عاجز آ جاتا۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان تو خیر وہ ثابت ہی ہو چکے تھے مگر اب تو بلائے جان بھی بنے جا رہے تھے۔ نیر نے پہلے گھما پھرا کر، پھر محتاط الفاظ کے ساتھ اور آخر صاف صاف ان سے کہہ دیا کہ ان کے متعلق اس کی رائے کیا ہے مگر جب وہ کچھ سمجھنے ہی کو تیار نہ تھے اور کسی بات پر بُرا مانتے ہی نہ تھے تو سوال یہ ہے کہ اب آخر نیر کیا کرتی۔ وہ ہر تحقیر کو پل

جانے کا ایسا سلسلہ قائم کئے ہوئے تھے کہ آخر نیر کے ترکش کے تمام تیر ختم ہو گئے اور اب وہ خود شکست خوردہ اور مظلوم نظر آنے لگی۔ اس مرتبہ اس نے زیدی کے جاتے ہی بیرا کو بلا کر اپنا غصہ اس پر اتارنا شروع کر دیا۔

نیر : میں پوچھتی ہوں تم لوگ آخر کس مرض کی دوا ہو۔ میرے کمرے میں بغیر اجازت کے کسی کو آنے کی جرات ہی کیسے ہوئی۔

بیرا : سرکار میں ایک نئی بات کیسے کر سکتا تھا۔ اب تک سب بغیر اجازت ہی کے آتے جاتے رہے ہیں۔

نیر : کان کھول کر سن لو کہ آئندہ اگر کسی نے بغیر اجازت کے میرے کمرے میں قدم رکھا تو تمھاری خیر نہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ان زیدی قسم کے لوگوں کی بدتمیزیاں بڑھتی ہی رہیں۔

بیرا : اب معلوم ہو گیا سرکار۔ کیا مجال جو زیدی صاحب ادھر کا رخ بھی کر لیں۔

نیر : پاگل آدمی۔ میں سر کے درد میں تڑپ رہی ہوں اور وہ ۱۰ ماغ چاٹ رہا ہے۔ اُن سے صاف صاف کہہ دو کہ وہ ایک مہمان سے زیادہ اس گھر میں اور کچھ نہیں ہیں۔

بیرا : جو حکم ہو.....

نیر : اور سنو۔ آئندہ سے وہ ہمارے ساتھ چائے یا ناشتہ یا کھانا کچھ نہیں کھائیں گے۔ ان کے کمرے میں سب کچھ پہنچا دیا کرو۔

بیرا : ایسا ہی ہوگا سرکار۔

ایمان داری کی بات یہ ہے کہ نیر لاکھ چڑچڑی اور بددماغ سہی گرد وہ اپنے اخلاق کو اس حد تک پست کرنا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن زیدی کی بے حسی نے اُس کو

اپنے دل پر بہر کر کے یہ احکام بھی دینے پر مجبور کر دیا۔ اور تو اور بیرا بھی حیران تھا کہ خلافِ عادت سرکار کے مزاج میں سختی کے ساتھ ساتھ یہ کرخنگی کہاں سے آگئی۔ مگر وہ باوجود کچھ نہ سمجھنے کے تعمیلِ حکم کے لیے اپنے کو آمادہ کر چکا تھا اور زیدی کی ابھی سے تاک میں تھا۔

اچھے قسم کے جانور خرید کر سدھا سکتی ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ صرف الفاظ نہیں ہیں بلکہ نیر کی ضدی طبیعت ان الفاظ کو واقعہ بنانے کے لیے یقیناً بے قرار ہوگی۔ وہ نیر کی سخن پروری سے واقف تھا اور اسے معلوم تھا کہ نیر اپنی مہمل سے مہمل بات پر اڑ جاتی ہے تو نتائج کا اندازہ کئے بغیر من مانی کر کے رہتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آج مسعود نے نیر کے بیرے کو بلا بھیجا تھا تا کہ اس کو وہاں کے حالات تو معلوم ہوں۔ وہ بیرے کے انتظار میں یہ بھی بھول چکا تھا کہ یہ چائے کا وقت ہے اور طلعت چائے پر اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ بدستور برآمدے میں ٹہلتا رہا یہاں تک کہ خود طلعت کو آکر اس کو اس محویت سے چونکا نا پڑا۔

طلعت : تیسری مرتبہ چائے دم کر کے میز پر لائی گئی ہے۔

مسعود : اوہ، ابھی معاف کرنا۔ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ چائے پینا ہے۔ بس یہی سوچ رہا تھا کہ کوئی بات ہے ضرور جو میں بھول رہا ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ وہ چائے تھی۔

طلعت : یا تو آپ مجھ کو ضرورت سے زیادہ بے وقوف سمجھتے ہیں یا اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ خود ضرورت سے زیادہ عقل مند ہیں۔

مسعود : واقعات تو دونوں غالباً ٹھیک ہی ہیں، نہ جناب کی حماقت میں کوئی شک ہے نہ میری فراست میں کوئی شبہ۔ مگر یہ بات کیا ہوئی۔ یہ سوال اس وقت کیسے پیدا ہوا۔

طلعت : کھلی ہوئی بات ہے کہ آپ کو دن رات نیر کی فکر ہے۔ آپ کی جگہ میں ہوتی تو ان حالات میں مجھے بھی فکر ہوتی کہ نہ جانے یہ اونٹ کس کل بیٹھے گا۔

مسعود : طلعت تم جانتی ہو کہ میرے دل میں نواب صاحب مرحوم کا کتنا احترام



مسعود آئے کو تو اپنے محسن نواب ممتاز لدہ کے ایوان سے چلا آیا تھا مگر اس کو ہر وقت نیر کی فکر تھی کہ دولت مند باپ کی یہ خود سر اور خود مختار لڑکی کہیں اپنے کو کوئی ایسا نقصان نہ پہنچا بیٹھے جس کی تلافی ممکن نہ ہو۔ وہ بے شمار خطرات میں گھری ہوئی تھی اور سب سے بڑا خطرہ خود اس کی دولت تھی۔ اتنی دولت، المہر عمر، بھر مزاجی کیفیت کا یہ عالم، نہ جانے یہ خود پرست لڑکی کیا کر بیٹھے۔ زیدی سے اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ ان صاحب زادی نے کیا سلوک کیا، اور ظاہر ہے کہ ایسا ہی ناروا سلوک کیا ہوگا کہ زیدی جیسا بے حس انسان بھی نیر کے یہاں رہنا گوارا نہ کر سکا اور چند ہی دن میں اپنا بور یا بدھنا لے کر کچھ دن ایک ہوٹل میں پڑا رہا اور جب تمام امیدیں منقطع ہو گئیں تو کراچی سدھا گیا۔ اب مسعود کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ نیر کے بیرے کو جاسوس بنائے۔ جاسوسی سے اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ نیر کے حالات سے باخبر رہنا چاہتا تھا اور باوجود غیر متعلق ہو جانے کے اب تک اس بات کو اپنا فرض سمجھ رہا تھا کہ اگر نیر کوئی غلط قدم اٹھائے تو اس کو جہاں تک ممکن ہو سکے روکے۔ مسعود کو اگر کوئی اندیشہ تھا تو یہ کہ نیر کی دولت خود نیر کے لیے کوئی خطرہ نہ خرید لے۔ اس کے ذہن میں نیر کے یہ الفاظ برابر گونجا کرتے تھے کہ میرا باپ میرے لیے اتنا چھوڑ گیا ہے کہ میں اپنے روپے سے زیدی سے زیادہ

ہے۔ میں مرتے دم تک ان کا احسان نہیں بھول سکتا۔ اور میرا ضمیر مجھ سے بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ میرے اپنے کو کسی آزمائش میں مبتلا کر لیا تو حشر کے دن نواب صاحب میرا گریبان پکڑیں گے۔

طلعت : واقعہ بھی یہی ہے مگر میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ آپ نیر کو کیوں کر ان آزمائشوں اور ان خطروں سے بچا سکیں گے جن کا آپ کو اندیشہ ہے۔ جب اس نے طے یہی کر لیا ہے کہ وہ آپ کے ہر مشورے کی خلاف ورزی کرے گی تو آپ کیا کر سکتے ہیں۔

مسعود : یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ یہ طے کر چکی ہے۔

طلعت : زیدی صاحب سب کچھ تو بتا چکے ہیں کہ وہ آپ کا نام سن کر کس قدر چراغ پا ہو جاتی ہے اور صاف صاف کہہ چکی ہے کہ مجھے وہ جنت بھی نہیں چاہیے جس کی طرف مسعود نے اشارہ کیا ہو۔

مسعود : یہ اشتعال تو ممکن ہے زیدی کی حماقت مابی کا نتیجہ ہو۔

طلعت : مجھے تو زیدی بے چارے پر ترس آتا ہے، بہت دن اس امید میں ہوئی

ہی میں رہ کر کاٹ دے کہ شاید اب نیر بلا سمجھیں۔ شاید اب آئے بلاوا۔

مسعود : کاش نیر نے زیدی کی قدر کی ہوتی۔ نیر اگر کسی کے ساتھ خوشگوار زندگی

بسر کر سکتی تھی تو وہ صرف زیدی تھا جو سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہ

تھا، جس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، جو اپنی شخصیت کو بھلا سکتا تھا اور جو نیر

کے کمون کے ساتھ اپنے کو ہر وقت بدل سکتا تھا۔ ایسا بے وقوف اب

اور کون طے گا۔

طلعت : اچھا اب چائے کی میز پر چلیے تاکہ میں چوتھی مرتبہ چائے دم کر کے

لاؤں۔ وہیں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔

مسعود : دراصل میں نے اس وقت نیر کے بیرے کو بلا بھیجا ہے۔ میں یہاں اُسی کا انتظار کر رہا تھا۔

طلعت : تو میں چائے نہیں لے آتی ہوں۔ یا آپ چلیے جب وہ آئے گا تو اطلاع ہو جائے گی۔

مسعود : جو رائے ہو۔ چلو اندر چلیں۔ لیجیے وہ تشریف لا رہے ہیں۔ اب یہیں مٹکا لو چائے (بیرے سے) آؤ بھی آؤ۔ ادھر نکل آؤ۔

بیرا : سلام چھوٹے سرکار۔ ایسا سنا کر دیا ہے حضور نے کہ میں کیا کہوں۔

مسعود : تم خیریت سے تو ہو؟ تم نے تو بھلا ہی دیا بالکل۔ اگر آج میں نہ بلواتا تو آج بھی کیوں آتے۔

بیرا : جان بوجھ کر چھوٹے سرکار ایسی بات تو نہ کہیے۔ آپ جانتے ہیں صاحب زادی کا مزاج۔ اس وقت بھی پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے ڈاکٹر کے یہاں جانے کا کہہ کر آیا ہوں۔

مسعود : بیٹھ جاؤ نا اس موٹے پر۔

بیرا : نہیں چھوٹے سرکار۔ آپ میرے جب بھی مالک تھے اب بھی مالک

ہیں۔ میری کیا مجال کہ برابر بیٹھوں۔ اللہ جانتا ہے ہر ایک سے یہی کہتا

ہوں کہ رحمت کا فرشتہ چلا گیا اس گھر سے۔

مسعود : بھی میں نے تم کو بلایا ہی اس لیے ہے کہ تم نواب صاحب مرحوم کے

زمانے کے آدمی ہو۔ اب وہاں میں نہیں ہوں تو تم ہی صاحب زادی کا

ذرا خیال رکھنا۔

بیرا : کیا باتیں ہیں چھوٹے سرکار آپ کی بھی۔ میں لاکھ سمجھوں کہ میں نواب

صاحب کے زمانے کا نمک خوار ہوں مگر میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے،

صاحب زادی بھی تو سمجھیں۔ اور حضور سواتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ جب آپ ہی نہ سمجھا سکے تو کون مائی کالال ہے جو اُن کو سمجھا سکے گا کچھ۔

مسعود : رنگ کیا ہیں آج کل۔

بیرا : بے ڈھب رنگ ہیں حضور۔ عقل کام نہیں کرتی حضور کہ ہو کیا رہا ہے اور ہونے والا کیا ہے۔ زیدی میاں کے جانے کی خبر تو ہو چکی ہوگی۔

مسعود : ہاں وہ تو مجھے معلوم ہے۔

بیرا : کان پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں سرکار۔ وہ سلوک ہوا ہے اُن بے چارے کے ساتھ کہ وہی تھے جو اتنے دن بھی رہ لیے۔ کھانے کی میز پر ان کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ کوٹھی کے اندر وہ نہیں جاسکتے تھے، بس باہر کے کمرے میں پڑے سوکھا کرتے تھے۔ چائے، ناشتہ، کھانا سب وہیں ان کو مل جاتا تھا۔

مسعود : یہ سب کچھ معلوم ہے کہ ایک مہمان کے ساتھ یہ سلوک اُس باپ کی بیٹی نے کیا ہے، جس کی مہمان نوازی کی دھوم تھی۔

بیرا : اب میں کیا کہوں حضور۔ پہلے حکم ہوا کہ کھانے سے ٹھٹھا کم کیا جائے ان کے لیے، پھر حکم ہوا کہ چائے کا ناشتہ کم کیا جائے۔ اور آخر میں تو بس دال سالن چپاتی رہ گئی تھی اُن بے چارے کے حصے کی اور ذلتیں الگ۔ اور یہ سب کچھ وہ سہتے رہے۔ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے۔

مسعود : خیر یہ تو سب کچھ اس لیے ہوا کہ وہ میرا دوست تھا۔ مگر اب کیا حال ہے۔

بیرا : چھوٹے سرکار اب تو رنگ ہی کچھ اور ہے۔ ایک رنگروٹ جانے کس

جنگل سے پکڑ والیا ہے۔

مسعود : رنگروٹ.....؟ کیا مطلب.....

بیرا : اے حضور ایک جنگلی سا آدمی ہے۔ ایک دن موٹر پر پیچھے بٹھالائیں۔ میں سمجھا کہ کوئی نیا نوکر لائی ہیں۔ مگر مجھے حکم دیا کہ اس کو پہلے مائی کے سپرد کرو کہ حجامت بنائے۔ پھر اس کو غسل کراؤ اور آدمی بنا کر میرے سامنے لاؤ۔

مسعود : یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ آخر یہ ہے کون؟

بیرا : اللہ جانے کون ہے حضور۔ اچھا خاصا بن مانس معلوم ہوتا ہے۔ تو حضور اس اللہ کے بندے کو نہلاؤ، ہلا کر آدمیوں کے سے کپڑے پہنائے گئے اور اب جو صاحب زادی کے سامنے پیش کیا گیا تو حکم ہوا کہ اس کو آپ کے کمرے میں رکھا جائے۔

مسعود : یعنی میرے کمرے میں۔ میرا کمرہ کہاں سے آیا وہ۔ اچھا پھر..... پھر کیا ہوا۔ تم نے تو عجیب قصہ سنایا آکر۔

بیرا : اے حضور وہ مصیبت آئی ہوئی ہے آج کل کہ میں کیا کہوں۔ اب وہ گنوار آپ کے کمرے میں رہتا ہے۔ اور وہ ٹھکانی ہوئی ہے اُس کی دن رات کہ میں کیا کہوں۔

مسعود : ٹھکانی ہوتی ہے؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

بیرا : حضور میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اُس جانور کو آدمی بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور لکھوا لپیچے مجھ سے کبھی جو وہ آدمی بنے۔

مسعود : بیرا تم بیٹھ جاؤ۔ ارے بھئی میں نے کہا سنی ہو طلعت۔ چائے تو رکھ دو۔ یہ تو عجیب خبر لائے ہیں۔ دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ نیر جو کچھ کہتی ہے وہ کر

کے بھی دکھا سکتی ہے۔ اُس نے واقعی ایک جنگلی جانور سدھانا شروع کر دیا ہے۔

طلعت : کیا مطلب؟

مسعود : ان سے معلوم ہوا ہے کہ نیر ایک گاؤں کی قسم کا آدمی کہیں سے پکڑ لائی ہے جسے اس کمرے میں رکھا گیا ہے جس میں رہتا تھا اور آج کل اس کی مرمت ہو رہی ہے۔

بیرا : ایسی ویسی مرمت سرکار! صبح سے اُنھ کو اس کی وہ گت جنتی ہے کہ یاد کرتا ہوگا وہ بھی۔ صبح اس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے داڑھی موٹنے کا سامان اور صاحب زادی کھڑی ہوتی ہیں ہنر لے کر کہ بناؤ اپنے ہاتھ سے داڑھی۔

طلعت : سچ کچ کیا داغ بالکل ہی مل گیا ہے۔

مسعود : لو بیرا چائے پیو۔

بیرا : اللہ سلامت رکھے حضور کو۔

مسعود : اچھا پھر داڑھی بنتی ہے۔

بیرا : حضور داڑھی کیا بنائے گا وہ گھاس چھیلتا ہے۔ سارا منہ لبو لبہاں الگ کرتا ہے اور صاحبزادی کی ڈانٹ اور ہنر الگ کھاتا ہے۔ داڑھی بنانے کے بعد اس کو غسل کرایا جاتا ہے۔ پھر کپڑے بدلوائے جاتے ہیں۔ آج ٹائی باندھنے کا سبق دیا گیا ہے۔

مسعود : یعنی واقعی؟ ٹائی باندھنے کا سبق بھی ایک ہی رہا۔

بیرا : بہت پینا گیا ہے آج۔ اس سے کسی طرح بندھتی ہی نہ تھی ٹائی۔ خیر تو حضور کپڑے بدلنے کے بعد اس کو میز پر چائے پینا سکھایا جاتا ہے۔ پھر

آ جاتا ہے اس کا ماسٹر، اُس سے پڑھتا ہے وہ۔

طلعت : ارادہ کیا ہے آخر نیر کا۔ واقعی یہ تو بالکل وہی ہو رہا ہے جس کا آپ کو اندیشہ تھا۔

مسعود : نہیں صاحب، مجھ کو اس حد تک اندیشہ نہ تھا۔ یہ تو کمال ہی کر دیا نیر نے۔ ہاں بیرا پھر کیا ہوتا ہے؟

بیرا : تو حضور، ماسٹر سے پڑھنے کے بعد دن بھر صاحب زادی اس کو سبق یاد کراتی ہیں، کھانے کا وقت آ گیا تو کھانا کھانے کی تعلیم شروع ہو گئی کہ اس ہاتھ میں کاٹنا پکڑو۔ اس ہاتھ میں چھری تھامو۔ یوں کاٹو اور یوں کھاؤ۔ کبھی وہ چھری منہ میں لے جائے اور کبھی کاٹنا اور کھانا پلیٹ میں دھرا رہے، اوپر سے ہو اس کی مرمت۔ یاد کرتا ہوگا وہ بھی کہ کہاں آچھنسا ہوں۔

مسعود : وہ کبھی کچھ بے تکلفی بھی کرتا ہے؟

بیرا : نہیں سرکار اُس کی کیا بھال ہے۔ اُس کی جان نکلتی ہے صاحب زادی کو دیکھ کر۔ کل صاحبزادی نے دیکھ لیا کہ ٹل کھول کر چلو سے پانی پی رہا تھا، اب جو بر سے ہیں اس پر ہنر تو طبیعت ہری ہو گئی ہوگی۔

مسعود : مگر تمہارا خیال کیا ہے۔ یہ سب کچھ ہو کیوں رہا ہے۔

بیرا : یہی تو عقل حیران ہے حضور۔ اس کے لیے بہت سے کپڑے تو آپ ہی کے موجود تھے اور کچھ کپڑے نئے سلوائے گئے ہیں۔ اب شاید صاحب

زادی کچھ تھک گئی ہیں۔ ایک میم بلانی گئی تھی، اس کی دیکھ بھال کے لیے۔

طلعت : لیجیے مبارک ہو گو نرس رکھی جا رہی ہے۔

شُرپ۔ اور پھر جو صاحب زادی نے کانٹا اٹھا کر ایک کچوکہ دیا ہے اس کے ہاتھ میں تو تھلا گیا۔

طلعت : سچ عجیبہ تماشہ دیکھنے کو تو دل چاہئے لگا۔

مسعود : تم سے زیادہ میرا دل چاہتا ہے یہ تماشہ دیکھنے کو۔ اچھا یہ بتاؤ بھیرا، کبھی تم کو اس سے بات کرنے کا موقع بھی ملا کہ وہ آیا کہاں سے تھا۔ کون ہے اور نیر کے ہاتھ کیسے لگا۔

بھیرا : سرکار ایک مرتبہ آگیا تھا وہ میرے کوارٹر میں کہیں سے ایک بیڑی لا کر پلا دو۔ اُس دن اُس سے کچھ باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ بے چارہ مظلوم ہے۔ کوئی جھوٹا مقدمہ چل گیا تھا اُس پر اور وہ جیل کاٹ کر اسی دن نکلا تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جائے اور کیا کرے کہ صاحب زادی موٹر پر ادھر جا نکلیں اور وہیں پٹرول ختم ہو جانے سے ان کو گاڑی روکنا پڑی۔ صاحب زادی نے اس کی مدد سے پمپ سے پٹرول منگایا اور اس کے حالات سن کر اس کو اپنے ساتھ لے آئیں۔

مسعود : نام کیا ہے ان حضرت کا۔

بھیرا : نام تو خدا بخش تھا مگر صاحب زادی نے اسلم رکھا ہے ان کا نام۔

مسعود : طلعت تم جس قدر حیران ہو میں اتنا تعجب نہیں کر رہا ہوں۔ اور اگر میرا

اندازہ صحیح ہے تو یہ سارا کھیل گویا مجھ کو جلانے کے لیے کھیا جا رہا ہے۔

نیر کا خیال یہ ہے کہ اگر وہ اس جانور کو انسان بنا سکی تو اس کو اپنے ساتھ

لیے گھومے پھرے گی۔ پارٹیوں میں اس کی نمائش کرے گی اور مقصد

صرف یہ ہوگا کہ مجھے اشتعال پیدا ہو۔ یہ گویا مجھ سے تمہارا انتقام لینے کی

ترکیب بنائی جا رہی ہے۔

بھیرا : جی ہاں یہی نام لیا تھا صاحب زادی نے بھی۔ شاید کل سے وہ آجائے۔

اس سے کہہ رہی تھیں کہ اس کو جتنی جلدی آدمی بنا دو گی اتنا ہی زیادہ انعام ملے گا۔

مسعود : عجیب سر پھری لڑکی ہے یہ بھی۔ اچھے خاصے گھر کو عجائب خانہ بنا رکھا ہے۔

بھیرا : کچھ پوچھے نہیں۔ ہم نوکروں کی الگ مصیبت میں جان ہے۔ اگر کوئی بدتمیزی وہ جانور کرتا ہے تو شامت ہم سب کی بھی آتی ہے۔ کل ہی وہ آنکھ پچا کر کچن میں آگیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ روٹی دو مجھے، بھوکا ہوں۔

طلعت : اتنی خاطر مدارت کے بعد بھی بھوکا؟

بھیرا : حضور بھوکا تو وہ رہ ہی جاتا ہے۔ چھری کانٹے سے بھلا اس کا پیٹ

بھر سکتا ہے۔ تو حضور مجھے بھی ترس آگیا اُس پر اور میں نے کچھ روٹی اور

ایک آدھ کباب دے دیا کہ کسی طرح اس کا پیٹ تو بھرے۔ اس نے

پوری روٹی کا ایک نوالہ بنا کر جیسے ہی ٹھونسا ہے، صاحب زادی آمو جو

ہوئیں اور پھر جو ہم لوگوں کی شامت آئی ہے تو اللہ دے اور بندہ لے۔

مسعود : کہہ دیا ہوتا تم نے کہ یہ آپ کا پالتو بھوکا تھا۔

بھیرا : صاحب وہ کہتی ہیں کہ بھوکا ہی رہنا چاہیے تاکہ یہ چھری کانٹے سے کھا

کر پیٹ بھرنا سیکھے۔ آج صبح ہی چائے کی میز پر پہلے تو اس نے چائے

پیالی سے پرچ میں انڈیل کر پینا چاہی۔ جب ڈانٹ پڑی تو چیچے سے

پینے کا ارادہ کیا۔ صاحب زادی نے پھر ایک ڈانٹ دی کہ دیکھو میں کس

طرح بیٹی ہوں۔ اس طرح پو۔ مگر اب جو وہ پیتا ہے تو آواز آئی

طلعت : کیا خوب انتقام ہے یہ بھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گویا میں بھی اتنی ہی گری ہوئی تھی جس کو آپ نے سہارا دے کر اپنی سطح پر لانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

مسعود : احمق لڑکی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے دماغ کی ساخت کیا ہے۔ بھرا یہ تو بتاؤ صورتِ شکل کیسی ہے بقول تمہارے اس رنگ روٹ کی۔

بیرا : اس کی اوقات سے کچھ باہر ہی سمجھے سرکار۔ بری صورت نہیں ہے۔ مگر ایسی بھی نہیں کہ کوئی گڑبڑ والی بات کا ڈر ہو۔

مسعود : نہیں نہیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ چند دن میں جب وہ اس جانور کو سدھالیں گی تو وہ سوسائٹی میں کیسا نظر آئے گا۔ طلعت تم حیران نہ ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں نیر کو وہ ڈرامہ کھیل رہی ہے اور جو کیرکٹر وہ اس محنت سے تیار کر رہی ہے وہ کامیاب بھی ثابت ہوگا۔ نیر میں یہی تو ایک بات ہے کہ دھن کی پکی ہے۔ جو سوجھ گئی بس سوجھ گئی۔

طلعت : آپ کا مطلب کیا ہے۔ یعنی وہ اس خدا بخش۔ یعنی اسلم کو سوسائٹی میں کیا بنا کر پیش کرے گی اپنا گویا..... یعنی.....

مسعود : ہاں ہاں اپنا انتخاب۔ اپنا پسندیدہ دوست۔

طلعت : دوست تک تو غنیمت ہے مگر کیا واقعی انتخاب بھی۔

مسعود : مجھے تعجب ہوگا اگر وہ اپنے انتخاب کی حیثیت سے اُسے پیش نہ کرے۔

طلعت : اور یہ سب کچھ محض ڈرامہ ہوگا آپ کے خیال میں۔

مسعود : قطعاً ڈرامہ۔ اصلیت سے کوسوں دور۔ اور مقصد صرف یہ ہوگا کہ اپنے جذبہ انتقام کو تسکین حاصل ہوتی رہے اور وہ یہ سمجھ سمجھ کر خوش ہوتی رہے

کہ اس نے مجھ سے بھرپور بدلہ لے لیا۔ کاش اُس عقل کی دشمن کو معلوم ہوتا کہ میں بھلا کیوں جلتے لگا۔ وہ اپنی غلطی سے خود جو کچھ میرے متعلق سمجھتی رہی ہے اگر وہ درست ہوتا تو میرے جلتے اور مشتعل ہونے کا سوال بھی پیدا ہوتا۔

طلعت : خیر یوں ہی سہی تو بھی انتقام لینے کا کتنا طویل راستہ اختیار کیا ہے۔ کب وہ اس کو تعلیم و تربیت دے چکیں گی۔ کب وہ سوسائٹی میں آنے کے قابل بنے گا اور کب ان کا جذبہ انتقام سرد ہوگا۔

مسعود : مگر یہ بھی تو مجبوری ہوگی اس کے سامنے کہ اگر وہ کسی پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی کا انتخاب کرتی تو ممکن تھا وہ حضرت خود ہی کہنا شروع کر دیتے کہ: دلِ نادان بہلتا نہیں بہلانے سے

طلعت : اور اگر لکھ پڑھ کر اور شعور حاصل کرنے کے بعد اس شخص نے بھی یہی کہا تو؟

مسعود : اس کے لیے ذرا مشکل ہوگا یہ کہنا۔ سن رہی ہو کہ اٹھتے جوتی بیٹھتے لات کا تو سلوک ہو رہا ہے اُس کے ساتھ۔ وہ بھلا یہ جرأت کر سکتا ہے۔

طلعت : مگر یہ سلوک ہمیشہ تو نہ ہوگا۔ آخر سمجھ آ ہی جائے گی کبھی نہ کبھی۔

بیرا : اچھا سرکار اب میں جانتا ہوں۔ نہ جانے کس بات پر میری تلاش شروع ہو جائے۔

مسعود : بھی تم کبھی کبھی ملتے رہا کرو تا کہ حالات تو معلوم ہوتے رہیں۔ یہ فرض

میرا اور تمہارا دونوں کا ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی روح کو کوئی تکلیف

نہ پہنچے دیں۔ تم سے وہاں کی باتیں معلوم ہوتی رہیں گی تو کم سے کم میں باخبر رہوں گا۔

بیرا : نہیں سرکار میں برابر آتا رہوں گا۔

مسعود نے بیرا کو انعام دے کر رخصت کر دیا اور طلعت چائے کا سامان سمیٹ کر اندر چلی گئی مگر مسعود پھر نیر ہی کے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچتا ہوا برآمدے سے نکل کر سڑک پار کر کے سامنے والے سبزہ زار پر ٹہلنے لگا۔ نیر کے متعلق اس کا ہر انداز اس لیے صحیح ہوتا تھا کہ وہ صورت حال پر نیر ہی کے زاویہ خیال سے غور کرتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ نیر کا دماغ کن زاویوں سے اپنے لیے کس قسم کی راہیں نکالنے کا عادی ہے اور وہ بالکل صحیح سمجھا تھا کہ یہ جانور جو اس محنت سے سدھایا جا رہا ہے بظاہر تو قطعاً غیر مضرت رساں ہے مگر طلعت کی یہ بات چبھ سی رہی تھی کہ وہ ہمیشہ ہی تو ایسا نا سمجھ نہ رہے گا۔ مسعود کو اس سلسلے میں نیر کی طرف سے تو پورا اطمینان تھا مگر واقعی یہ خدا بخش یعنی یہ اسلم اگر آدمیت کے جامے میں آکر چل گئے تو کیا ہوگا۔ ایک شخص کو فرضی طور پر سبکی اپنا مکر انتخاب، اپنا پسندیدہ دوست اور اپنا سب سے مقرب نوجوان بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرنا خود اس شخص کے دل میں بھی تو یہ خیال پیدا کر سکتا ہے کہ کاش یہ تمثیل واقعہ بن جائے مسعود دیر تک اسی فکر میں کھویا رہا اور آخر اس نے تھکے ہوئے انداز سے کہا۔ خیر یہ منزل ابھی دور ہے اور یہ فکر ابھی قبل از وقت ہے۔ وہ اپنے کو اس فکر سے زبردستی خالی لڈھن بنا کر گھر پہنچا ہی تھا کہ اس نے طلعت کو اپنا مختصر پایا اور طلعت کے چہرے پر بھی تفکر کی سنجیدگی دیکھ کر کہا:

مسعود : یعنی آپ بھی کوئی سیاسی تھی سلجھانے میں معروف ہیں یا کوئی لطم ہو رہی ہے۔

طلعت : جی نہیں، نہ لطم ہو رہی ہے نہ سیاسی تھی۔ مگر میں یہ سوچ رہی تھی کہ آخر دوسرے لوگ بھی تو خواہ کوئی واسطہ ہو یا نہ ہو دوسرے کے گھروں کی باتوں کے متعلق غور کیا ہی کرتے ہیں۔

مسعود : میں سمجھا نہیں تمہارا مطلب۔

طلعت : آپ دماغ کو اتنا تھکا چکے ہیں کہ صاف سی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ نیر نے جو تماشا شروع کر رکھا ہے اس کے متعلق آخر پاس پڑوس کے لوگوں کی کیا رائے ہوگی۔ آپ کے وہاں سے چلے آنے کو پھر زیدی کے نکالے جانے کو، پھر اس نئے جانور کے پالے جانے کو نہ جانے لوگ کس نظر سے دیکھ رہے ہوں گے اور کیا کیا معنی پہنارہے ہوں گے۔

مسعود : خیر دنیا کی زبان تو کوئی روک ہی نہیں سکتا۔ نام تو بادشاہوں پر بھی دھرے جاتے ہیں۔ مگر پاس پڑوس والے اور اس گھر سے جو ذرا بھی واقف ہیں وہ نیر کی مزاجی کیفیت سے واقف ہیں۔ ہنر بازی تو اس نے اب کی ہے مگر محلے کی عورتوں میں ہنر والی تو ہمیشہ سے مشہور ہے۔ میں ایک مرتبہ ایک دوست کے ساتھ سینما کا سکنڈ شو دیکھ کر آیا تو میری اس دوست کے سامنے وہ خبر لی کہ ان حضرت نے نیر کا عجیب نام رکھا تھا۔ ”ہر ہنر مس کر فیونیر ممتاز لڈھ ولہ“۔ یہ نام طلعت کو بھی ایسا پسند آیا کہ وہ اپنی ساری فکر بھول کر ہنسی سے لوٹ گئی۔



نواب ممتاز لدہ مرحوم کا وہ ایوان جو مرحوم کی زندگی میں عام طور پر علمی، ادبی اور انتخابات کے زمانے میں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہتا تھا آج کل ان کی صاحبزادی نیر کے ہاتھوں عجیب سرکس کا پنڈال بن کر رہ گیا تھا۔ جس میں نیر خدا جانے کہاں سے ایک انسانی شکل کا جانور پکڑ لائی تھی۔ وہ جانور جس کا غائبانہ تعارف بیرے نے مسعود اور طلعت سے کرا دیا تھا آج کل بڑے زور شور سے سدھایا جا رہا تھا۔ یہ خدا بخش جس کا نام نیر نے اسلم رکھا تھا ایک خالص گاؤدی قسم کا نہایت جاہل آدمی تھا مگر نیر کو تو جیسے جنون تھا کہ کسی طرح آدمیت گھول کر اس آدمی کو پلا دی جائے اور یہ شخص اس کی مرضی کے مطابق ایک اپنڈیٹ قسم کا مہذب، کلچرڈ اور ہر اعتبار سے اس قدر باقاعدہ نوجوان بن جائے کہ اونچی سے اونچی سوسائٹی میں جگہ حاصل کر سکے۔ ممکن ہے یہ بات ناممکن نہ ہو مگر جس قدر بے صبری سے نیر اس کی تربیت میں مصروف نظر آتی تھی اس کو دیکھتے ہوئے ہتھیلی پر سرسوں جتنا مشکل ضرور تھا۔ نیر نے اس کے لیے مس روپی نامی ایک اینگلو پاکستانی گورنس کا بھی تقرر کر دیا تھا تا کہ اپنا کچھ بوجھ ہلکا کر لے مگر مس روپی چونکہ ایک ہفتے سے پہلے اس جانور کو آدمی بنانے کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لے سکتی تھی لہذا نیر اسلم پر پورا وقت صرف کر رہی تھی۔ ادھر اس نوگرفتار وحشی کا یہ عالم تھا کہ اس کا ہر تیور پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ خداوند ایہ کس عذاب

میں پھنس گیا ہوں میں۔ رہ گئے گھر کے باقی نوکر چاکر، ان سب کے لیے ایک مستقل مصیبت کا زمانہ تھا یہ زمانہ بھی۔ خصوصاً اس لیے اور بھی کہ اسلم کا ہر غصہ ہر نوکر پر ہر وقت اتر سکتا تھا۔ اس وقت بھی نیر اپنے اس جانور کی پے در پے متعدد وحشیانہ حرکتوں سے مشتعل آنکھوں میں شعلے لیے بیرے پر اس کا غصہ اتار رہی تھی۔

نیر : جب میں اس کا نام اسلم رکھ چکی ہوں تو تم نے خدا بخش کہا کیسے؟
بی بی۔ میں نے پہلے اسلم صاحب کہا۔ پھر خالی اسلم کہہ کر آواز دی۔
جب یہ نہ بولا تو خدا بخش کہہ کر پکارا۔

نیر : کیوں جی کیا نام ہے تمہارا؟

اسلم : خدا بخش۔

نیر : خدا بخش نہیں، اسلم۔

اسلم : خدا بخش نہیں، اسلم۔

نیر : پھر کیوں بولے تم خدا بخش کے نام پر۔ خبردار جواب تم نے اپنا نام خدا بخش سمجھا۔ تمہارا نام اسلم ہے۔ مسٹر اسلم۔ سمجھے؟ کیا نام ہے تمہارا۔

اسلم : خدا..... نہیں نہیں۔ اسلم!

نیر : شاباش۔ جب تم سے کوئی پوچھے کہ تمہارا نام کیا ہے تو کہنا اسلم۔ کیا کہو گے.....؟

اسلم : وہی جو تم بتا رہی ہو۔

نیر : کیا بتا رہی ہوں میں؟

اسلم : اسلم اور کیا.....

نیر : اور ادھر تو آؤ۔ بڑھو آگے۔ یہ کیا ہے۔ یہ تمہارے کان پر کیا رکھا ہے۔ بدتمیز آدمی یہ تم نے بجا ہوا اسگریٹ کان میں کیوں لگایا۔ میں نے تم کو

قیمتی سگریٹ کے ڈبے اس لیے منجا کر دیے ہیں کہ تم بجھا ہوا سگریٹ کان میں لگائے پھرو۔ کیوں لگایا یہ تم نے..... اور میرا تم نے بھی اس احق کو نہیں بتایا کہ سگریٹ کان میں نہیں بلکہ ایش ٹرے میں بجھایا جاتا ہے۔

بی بی۔ میرے سامنے نہ انھوں نے بجھایا نہ میں نے کان پر لگاتے دیکھا۔ سگریٹ جلانے کے لیے یہ کچن میں گئے تھے تو میں نے سمجھا دیا تھا کہ سگریٹ چولھے کی آگ سے نہیں سلگاتے، دیا سلائی سے سلگاتے ہیں۔

نیر : دیکھو اسلم، اب نہ دیکھوں میں بجھا ہوا سگریٹ تمہارے پاس۔ سگریٹ جب بجھ جائے تو ایش ٹرے میں ڈال دیا کرو۔ ایش ٹرے جانتے ہو؟

اسلم : جانتے کیوں نہیں۔

نیر : جاؤ اٹھا کر لاؤ ایش ٹرے جلدی سے۔ چلو جلدی کرو..... اے۔ یو۔ یہ تم کچن کی طرف کیوں جا رہے ہو۔ ایش ٹرے کچن میں ہوتا ہے۔ اینڈیٹ جاؤ اپنے کمرے سے لاؤ جا کر..... میرا جب تک تم سب مل کر اس کو تیز نہ سکھاؤ گے یہ کچھ نہ سیکھ سکے گا۔ میرا تو اس نے کتے کا بھیج کر دیا ہے، دن بھر بھونکنا پڑتا ہے اس کے ساتھ، مگر تم لوگوں کا فرض ہے کہ تم بھی خیال رکھو۔

بی بی اب میں کیسے یقین دلاؤں آپ کو کہ کتنا سمجھاتا ہوں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ سگریٹ اس کی مرضی کے نہیں ہیں وہ تو بیزی ہی چٹا چاہتا ہے۔

نیر : خبردار جو کسی نے اس کو بیزی دی۔ اس کو سگریٹ ہی چٹا پڑیں گے۔ اگر میں نے اس کے پاس بیزی دیکھی تو تم لوگوں کی خیر نہیں..... اُف کم

بخت یہ کیا لا رہا ہے..... یو فلول..... یہ ایش ٹرے ہے؟ کل دن بھر تم کو بتایا ہے کہ ایش ٹرے کیا چیز ہوتی ہے اور اس سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ تمہارا دماغ کس چیز کا بنا ہوا ہے آخر۔ یہ تم فلا درواز کیوں لائے ہو۔ یہ ایش ٹرے ہے؟

بیرا : اسلم صاحب یہ تو گلدستہ لگانے کی چیز ہے۔ ایش ٹرے تو وہ ہوتی ہے جس میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہیں۔

نیر : تم یوں نہ مانو گے۔ پھر اٹھاؤں میں ہنر۔ کل دن بھر اس کوڑھ مغز کو سمجھایا ہے کہ یہ فلا درواز ہے اور یہ ایش ٹرے ہے۔ میرا تم جا کر ایش ٹرے لاؤ اور اس احق کو سمجھاؤ کہ اسے ایش ٹرے کہتے ہیں۔ خبردار جو اب تم نے بجھا ہوا سگریٹ پھر پینے کے لیے کہیں بھی رکھا۔ جب جی چاہے نیا سگریٹ ڈبے سے نکال کر سلگاؤ۔ سمجھ گئے؟ کیا بتایا میں نے تم کو ابھی۔

اسلم : نیا سگریٹ نکال کر سلگاؤں۔

نیر : ہاں۔ کوئی پروا نہیں سگریٹ ختم ہو جائیں گے تو اور آجائیں گے۔

بیرا : یہ دیکھیے۔ اس کو کہتے ہیں ایش ٹرے۔

اسلم : ایش ٹرے..... ٹھیک ہے۔ ایش ٹرے۔

نیر : اور ادھر تو آؤ، یہ تم نے کوٹ کی جیب میں کیا بھر رکھا ہے گلہری کا جمبوئجھ۔ بھاگتے کیوں ہو۔ چلو ادھر..... میرا پکڑنا اسے۔ ذرا دیکھنا اس کی جیب میں کیا ہے۔

بیرا : اماں دیکھنے تو دو بابا۔

نیر : کیوں نہیں دکھاتے۔ چھوڑو جیب اپنی۔ بے وقوف آدمی..... اتنے

ایچھے کوٹ کی جیب مسل کر رکھ دی۔
واہ صاحب واہ۔ وہی تو میں کہوں کہ ڈولی میں رکھی ہوئی ڈبل روٹی
زمین کھا گئی کہ آسمان نکل گیا۔
نیر : یہ کیا؟ ڈبل روٹی؟ یہ کیا بے ہودہ پن ہے۔ یہ تم نے ڈبل روٹی کیوں
چرائی۔ تم اپنی یہ چوریاں نہیں چھوڑو گے۔ بتاؤ کیوں چرائی تھی یہ ڈبل
روٹی۔

اسلم : اب نہیں چرائیں گے۔ خطا ہوئی۔
نیر : اب نہیں چراؤ گے۔ مگر چرائی کیوں تھی۔ میز پر اپنے سامنے میں نے تم
کو لچ کھلویا۔ اگر بھوکے رہ گئے تھے تو اور کھا سکتے تھے۔ میرے سے کہہ
دیتے وہ تمہارے کمرے میں قاعدے سے سلاکس کاٹ کر، سینڈو جڑ بنا
کر، ٹوسٹ سینک کر یہی ڈبل روٹی دے سکتا تھا۔ مگر تم اپنی عادت سے
بجور ہو۔ میرا ذرا میرا ہنر دو، میں اس کی کھال اتار کر رکھ دوں گی۔

اسلم : قصور ہوا۔ اب نہیں کروں گا۔ کان پکڑے۔
نیر : صاف کرو اس کم بخت کی جیب اور میز پر چائے لگاؤ۔ میرا اس کم بخت کو
پھر ٹھنڈا ناشتہ۔ اس نے تو ناک میں دم کر دیا ہے میرا۔
بیرا : بی بی۔ خطا معاف۔ نالی کے کیڑے کو عطر دان میں رکھیے گا تو مر جائے گا
غریب۔

نیر : بکومت۔ میں اس کے فرشتوں کو آدمی بنا کر رہوں گی۔ اس کو آدمی بنا
پڑے گا۔ اے۔ یہ کیا بد تمیزی ہے۔ خارش کتے کی طرح سر کیوں کھجا
رہے ہو۔ تمیز سے نہیں کھجایا جاتا سر۔ میرا اس کو بتاؤ کہ صاحب لوگ
کیسے سر کھاتے ہیں۔

اسلم : اے ریٹ رین..... ایک موٹا آدمی۔
نیر : پھر وہی، دیکھ رہے ہو میری طرف اور پڑھ رہے ہو کتاب۔ اور یہ پڑھا
کیا ہے، پھر سے آنکھیں کھول کر پڑھو۔ غلط پڑھا اور بر سے ہنر۔
اسلم : اے فیٹ مین..... ایک چوہا دوڑا۔

بیرا : دیکھو بھائی، صاحب لوگ اول تو کھاتے ہی نہیں سر۔ کھجلی ہو تو ضبط
کرتے ہیں اور بہت ہی کھجلی ہو تو بال درست کرنے کے بہانے سے
سر پر ہاتھ لے جاتے ہیں اور بال ٹھیک کرتے ہیں چپکے سے کھجا بھی
لیتے ہیں۔

نیر : اسی طرح اگر ایک ایک بات تم لوگ سمجھاتے رہو تو مجھے یوں سر کھپاتا
کیوں پڑے۔ اچھا جاؤ تم اپنی کتاب لے کر آؤ۔ سبق یاد ہوا تو چائے
لے گی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب میں تم کو پیٹ کی مار دوں گی..... دیکھو
جلدی آنا بیٹھ نہ رہنا۔

بیرا : ٹھیک ہو جائے گا بی بی۔ ابھی نئی نئی بات ہے۔ گھبرا یا ہوا ہے غریب۔
نیر : سخت کوڑھ مغز ہے۔ کوئی بات یاد ہی نہیں رکھتا۔
بیرا : بی بی آپ بے کار ہلکان ہوتی ہیں، ان کو تو وہی میم صاحب ٹھیک کریں
گی۔

نیر : وہ کم بخت بھی تو ایک ہفتے سے پہلے نہیں آسکتیں۔ لے آئے کتاب۔
ادھر بیٹھو اس کرسی پر۔ میرا تم چائے کا انتظام کرو۔ مسٹر اسلم بھوکے ہیں۔
لیکن اگر سبق یاد نہ نکلا تو ان کا فائدہ۔ ہاں مسٹر کھولنا کتاب میرا منہ کیا
دیکھ رہے ہو۔ اپنی طرف کر کے کھولو۔ کتاب پڑھنا تمہیں ہے کہ مجھے۔
ہاں پڑھو کیا پڑھایا تھا میں نے۔

اسلم : اے ریٹ رین..... ایک موٹا آدمی۔
نیر : پھر وہی، دیکھ رہے ہو میری طرف اور پڑھ رہے ہو کتاب۔ اور یہ پڑھا
کیا ہے، پھر سے آنکھیں کھول کر پڑھو۔ غلط پڑھا اور بر سے ہنر۔
اسلم : اے فیٹ مین..... ایک چوہا دوڑا۔

نہیں۔ ہوتو دے دو چپکے سے دو دم لگالوں۔

بیرا : معلوم ہو گیا بھیا تمہیں موت ہی نے گھیر رکھا ہے۔ اماں پڑھتے ہو کہ کہوں میں بی بی سے جا کر۔

اسلم : اے۔ ریٹ۔ رین، مگر یار یہ مجھ کو پڑھا کیوں رہی ہیں، بے فضول بن تا حق۔

بیرا : واہ ری تیری عقل۔ استاد پڑھ جاؤ گے تو مزے کرو گے۔ واہ ری تیری شان۔ یہ ساٹھ ساٹھ روپے گز کے کپڑے کے سوٹ اور یہ تم۔

اسلم : سچ مانو بڑی الجھن ہوتی ہے ان کپڑوں میں، نہ آدمی بیٹھ سکے نہ لیٹ سکے اور یہ جو گلے میں پھندہ پڑا ہے یہ تو اللہ جانتا ہے پھانسی سے کم نہیں، بات ترے کی، ہیں نہیں تو کیا۔

بیرا : اماں یہ کیا کیا، کھول ڈالی ٹائی۔ اب دیکھا وہ بے بھاؤ کی پڑیں گی کہ یاد کرو گے۔ باندھو جلدی اگر خیریت چاہتے ہو۔

اسلم : اچھی زبردستی ہے۔ دم گھنا جاتا ہے۔

بیرا : اماں باندھتے ہو کہ نہیں۔ کیوں یار اپنے ساتھ ہم غریبوں کے بھی پیچھے پڑے ہو۔ معلوم ہوتا ہے نوکری چھوڑوا کر رہو گے۔ دیکھو وہ آ رہی ہیں۔ اب آئی شامت۔

نیر : (آتے ہوئے) یاد کیا سبق تم نے؟..... اور یہ کیا؟ یہ ٹائی کیوں کھولی۔

اسلم : سانس الجھ رہی تھی ہماری۔

نیر : سانس الجھ رہی تھی؟ یہ جو سارا زمانہ ٹائی باندھ پھرتا ہے سب کی سانس الجھتی ہے۔ باندھو جلدی۔ خدا سمجھے تم سے، کار کا بھی تاس مار کر رکھ دیا۔

جلدی کرو۔ ارے، ارے، ارے۔ یہ ٹائی باندھ رہے ہو یا بستر بند میں

گرہ لگا رہے ہو۔ اوکم بخت یہ نہایت قیمتی ٹائی ہے جسے اس بے دردی سے مروڑا جا رہا ہے۔ پھر وہی، اسی طرح باندھنا سکھائی تھی۔

اسلم : ٹھیک ہے۔ بھول گیا تھا، اے یوں۔

نیر : معلوم ہوتا ہے ہڈیاں چلچلا رہی ہیں۔ اٹھنا میرا یہ ہنر میرا۔

اسلم : ارے نہیں۔ ابھی باندھتا ہوں۔ ابھی، ابھی لو۔

نیر : تم نے بغیر پوچھے کھولی کیوں ٹائی (ہنر تان کر) کیوں کھولی تھی۔ بولو

(پھر مارتی ہے اور اسلم بھیس بھیس کر کے روتا ہے) ایڈیٹ، بے وقوف، گلدھا۔

اب بتائیے سرکس کا پنڈال غلط تو نہیں کہا تھا۔ یہ خدا بخش یعنی یہ اسلم جانور نہیں تو اور کیا تھا۔ بلکہ جانور کو سدھا لینا شاید آسان ہو۔ انسان کو انسان بنانا؛ تا آسان نہیں ہے۔ وہی مثل کہ سوتے کو تو جگایا جاسکتا ہے، جاگتے کو کوئی کیا جگائے۔ بڑھے طوطے مشکل ہی سے پڑھ سکتے ہیں اس لیے کہ وہ باقاعدہ طوطا بن چکے ہیں۔ اسلم بھی اپنے گاؤ دی پن میں رانچ ہو چکا تھا مگر نیر کو تو جیسے ضد تھی کہ اسی پتھر سے پسینہ نکالے گی، اسی کان نمک سے شہد نچوڑے گی۔ اس کی طبیعت کا خاصہ ہی یہ تھا کہ ناممکن کو ممکن بنائے۔ جو کام جتنا مشکل نظر آتا تھا اتنی ہی اس کی ضد بڑھتی جاتی تھی۔ اسی ضد کی بدولت آج کل وہ سب کچھ بھولے ہوئے تھی۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ نہ کسی سے ملنا، نہ سیر، نہ تفریح۔ صبح سے شام تک بس یہی ایک مشغلہ تھا کہ اٹھنا، بیٹھنا، پہننا، اوڑھنا، کھانا پینا، لکھنا پڑھنا سکھا رہی ہے۔ اس کے لیے قیمتی سے قیمتی لباس موجود تھے۔ ایک بڑے آدمی کی ضروریات کی جتنی چیزیں ہو سکتی ہیں سب مہیا تھیں۔ مگر وہ رہ کر قیمتی سگریٹوں سے بیڑی کی طرف بھاگنا چاہتا تھا۔ اعلیٰ درجے کے

سوٹ چھوڑ کر اپنے ذیلے ڈھالے کرتے اور تہبند کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میز پر چھری کاٹنے سے کھانے کے بجائے اکڑوں بیٹھ کر ہپڑ ہپڑ کھانے اور غپ غپ پینے کے لیے ترس رہا تھا۔ بیرے نے سچ کہا ہے کہ نالی کے کیڑے کو عطر دان میں بند کرنا اس کے لیے مہلک ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلم پر کیا گزرتی ہے اور نیر اسلم کو کیا بنا سکتی ہے۔

اس وقت جب دو چار ہاتھ پڑ گئے اور یہ حضرت باقاعدہ پورا منہ کھول کر پوری آواز سے رو پکے تو اپنی اس حماقت پر خود نیر کو خلاف وضع ہنسی آگئی۔

نیر : توبہ ہے، میں نے بھی کیا مہیت اپنے سر لی ہے۔ نہ جانے یہ کم بخت بندر والے اور ریچھ والے کیسے سدھا لیتے ہیں اپنے جانوروں کو۔ یہ کم بخت انسان تو سب سے بڑا جانور ثابت ہوا۔

بیرا : سرکار گستاخی معاف۔ آپ لاکھ اس کو سدھائیں، لاکھ سکھائیں، پڑھائیں مگر سوری کی اینٹ مشکل ہی سے چوبارے چڑھے گی۔

نیر : خیر تم لوگوں کی ان باتوں سے میں ہمت ہارنے والی نہیں ہوں۔ اگر جنگلی جانور سدھائے جاسکتے ہیں۔ طوطا پڑھایا جاسکتا ہے۔ مینا بول سکتی ہے۔ بندر ڈگڈگی پر ناچ سکتا ہے تو یہ تو پھر بھی انسان ہے۔

بیرا : سرکار یہ لاکھ لکھ پڑھ جائے مگر اصلیت نہیں چھوڑ سکتا۔ سب کچھ سیکھ کر بھی دیکھ لیجیے گا کہ جب اصلیت پر آئے گا تو سارا لکھا پڑھا دھرا رہ جائے گا۔ آپ اس کو اتنے قیمتی کیڑے بنوا کر دیتی ہیں اور وہ ان ہی سے گھبراتا ہے۔ آج ہی اس نے نالی اس بری طرح کھولی ہے کہ میں منع کرتا رہ گیا مگر اس نے کہا کہ یہ تو میرے ساتھ زبردستی ہو رہی ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بغیر بیڑی پنے میرا دماغ چکراتا رہتا ہے۔

نیر : دماغ چکراتے دو مگر خبردار جو کسی نے اس کو بیڑی دی۔ کچھ دنوں میں ان ہی سگریٹوں اور اسی لباس اور کھانے کا عادی ہو جائے گا۔

بیرا : اب ذرا دیکھ لیجیے۔ اس پیر کا جوتا اس پیر میں پہننے کی کوشش کر رہا ہے۔

نیر : او جانور۔ او گدھے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ادھر آؤ، چلو ادھر۔ یہ جوتا تم نے اس پیر کا اس میں کیوں پہنا ہے؟

اسلم : یہ اس پیر کا ہے۔

نیر : تم کو کل کتنی مرتبہ سمجھایا ہے، تمہارے دماغ میں بھوسا بھرا ہے یا گھاس؟

اسلم : دماغ میں؟

بیرا : کھوپڑی کو کہہ رہی ہیں سرکار۔

نیر : بیرا اس کو لے جاؤ میرے سامنے سے نہیں تو مارتے مارتے کھال اتار لوں گی۔ دُور ہو یہاں سے۔



مس روپی کی تربیت اور نیر کی سرگرمیوں نے اسلم میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس کو ٹائی باندھنا آگئی تھی۔ وہ اب کانٹے کے ہاتھ میں کانٹا اور چھری کے ہاتھ میں چھری لینے لگا تھا۔ وہ سگریٹ الٹش ٹرے میں بجھانے کا عادی ہو گیا تھا۔ شیو کرتے ہوئے اب وہ چر کے نہ لگتے تھے جن سے سارا چہرہ لبو لبان نظر آئے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب اس کی وہ مرمت نہ ہوتی تھی جس سے وہ خواہ مخواہ مظلوم اور نیر بلا وجہ نہایت خوف ناک مجنوں نظر آیا کرتی تھی۔ مس روپی کی تربیت کا طریقہ نہایت مشفقانہ تھا جو اسلم کے لیے نہایت کارگر ثابت ہوا۔ وہ اس مامتا اور دُلا ر کے ساتھ اس بوڑھے طوطے کی تربیت میں مصروف تھی گویا وہ ایک اچھی گورنس ہی نہیں بلکہ تعلیم بالغان کی بہت بڑی ماہر ہے اور اسی کے مشورے پر چل کر نیر نے بھی اپنی سخت گیر پالیسی میں تبدیلی پیدا کر دی تھی بلکہ جب اُس نے مس روپی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھا تو اندازہ ہوسکا کہ وہ نیر جو اس قدر خوف ناک اور پاگل پن کی حد تک خوں خوار نظر آتی تھی دل ہی دل میں اپنی ان غمتوں پر گھٹل رہی تھی اور اسلم کے لیے بعض اوقات اس کا دل کس قدر کڑھتا تھا۔ اس نے مس روپی کے سامنے یہاں تک اعتراف کیا کہ اسلم پر سختی کرنے کے بعد میں خود اپنی نظروں سے گر جایا کرتی ہوں اور مجھ کو اسلم ایک ایسا قیدی نظر آنے لگتا ہے جس پر کوئی جھوٹا مقدمہ چلا ہو۔ اور

جسے قید با مشقت کی سزا خواہ مخواہ ہوگئی ہو اور میں خود اپنے کو ایک ظالم جیلر محسوس کرتی ہوں۔ اس نے مس روپی سے یہ بھی اقرار کر لیا کہ یہ غصہ لگی اور کا ہے جو بے گناہ اسلم پر اترتا ہے۔ میں یہ سب کچھ محسوس کرتی ہوں مگر پھر انتقام کے جوش میں یہی سب کچھ کر گزرتی ہوں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ جس آگ میں اس وقت میں جل رہی ہوں اُسی آگ میں مسعود کو جلا دیکھ کر اپنا دل ٹھنڈا کروں۔

مس روپی بڑی جہاں دیدہ عورت تھی وہ بہت جلد تہہ تک پہنچ گئی اور اب وہ صرف اسلم کی گورنس ہی نہ تھی بلکہ نیر کی بھی ایک ہمدرد سیٹھی ثابت ہو رہی تھی اور اس کی موجودگی نے نیر پر بھی نہایت خوشگوار اثر کیا تھا۔ اس خوشگوار اثر کی سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ اسلم بہت تیزی کے ساتھ آدمی بن رہا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی مس روپی خوشی سے کھلی ہوئی نیر کے کمرے میں اس طرح آئیں جیسے کوئی عید کے اس چاند کی خبر لایا ہو جو انیس تاریخ کو یکا یک ابرے سے نمودار ہو گیا ہو۔

روپی : بی بی۔ یہ دیکھیے۔ ادھر آؤ اسلم۔ آجاؤ آگے، یہ دیکھیے بی بی۔ یہ بوا اسلم نے خود باندھی ہے۔ کس قدر پر فلت ہے۔

نیر : جانے بھی دو مس روپی، اتنی خوب صورت بوتو بڑے بڑے باندھنے والے ابھی مشکل سے باندھ سکتے ہیں۔

روپی : By God انھوں نے خود باندھی ہے۔ مسٹر اسلم تم خود بتاؤ یہ کس نے باندھی ہے۔

اسلم : میں نے خود باندھی ہے۔ میں کھول کر پھر باندھ سکتا ہوں۔

نیر : بھلا باندھ تو سکی میرے سامنے۔

اسلم : یہ لیجیے..... میں شیشہ دیکھ لوں آپ کا؟

نیر : بڑے شوق سے۔

- اسلم : یہ دیکھیے پہلے یہ گرہ لگائی۔ پھر اس سرے کو یوں پکڑا اور اس دوسرے سرے کو اس طرح کیا۔
- روبی : شاباش۔ ٹھیک ہے بالکل۔
- اسلم : اور اس طرح کس کر درست کر لیا۔
- نیر : ہاں واقعی۔ اسلم تم تو بڑے قابل ہو گئے ہو۔
- روبی : ہنسو اس بات پر۔
- اسلم : (معمولی سی ہنسی ہنس کر) ہئی ہئی۔
- روبی : نہیں نہیں یہ ہنسی نہیں۔ وہ ہنسی ہنسو جو میں نے تم کو کل سکھائی تھی۔
- اسلم : اچھا وہ ہنسی (پھر ہنس کر) ہا۔ ہا۔ ہا۔
- روبی : Good یہ موقع اسی قسم کی ہنسی کا تھا۔ آج تو بی بی مسز اسلم نے سبق بھی خوب یاد کیا تھا اور آج جب میں صبح ان کو جگانے گئی تو یہ خود شیو کر رہے تھے۔ دیکھ لیجیے آج ان کے گال پر کوئی زخم نہیں پڑا۔
- نیر : زخم کیوں پڑتا۔ اب وہ باقاعدہ صاحب لوگ بن گئے ہیں۔
- روبی : اور دیکھیے مسز اسلم Have you got time?
- اسلم : I...don't mind
- روبی : نہیں، نہیں..... یہ تو تم دوسری بات کہہ گئے۔ اچھا اب بتاؤ Would you lik to smoke?
- اسلم : Five to four
- روبی : نہیں مسز۔ تم گھبراتے کیوں ہو۔ گز بڑ نہ کرو۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ تو آج تم کو موٹر کی ہوا کھلائی جائے گی۔ بی بی، آج ہمارے مسز اسلم کو سنیمیا ضرور دکھائیے۔ ہاں اب بتاؤ Have you got time?

- اسلم : Don't mention
- روبی : نہیں مسز نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں نا تم ہاتھ اس طرح سیدھا کرو کہ کوٹ کی آستین اوپر کھسک جائے پھر کلائی سامنے لا کر گھڑی دیکھو اور میرے سوال کا جواب دو۔ Have you got time?
- اسلم : Five to four
- روبی : شاباش۔ مگر یہ جواب مسکرا کر دیا کرو۔ یہ کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ بی بی ابھی یہ سبق کچا ہے، ذرا ایک آدھ دن میں دیکھیے گا کہ یہ نر فر جواب دیں گے۔ مسز اسلم اتنے بے وقوف نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔
- نیر : مگر میں تو چاہتی ہوں کہ خواہ کتنے ہی بے وقوف رہیں مگر نظر بالکل نہ آئیں۔
- روبی : یہی ہوگا۔ میں ان کے چہرے کی بے وقوفی برابر کھرچ رہی ہوں۔ مسز اسلم Please give me that book
- اسلم : Sorry
- روبی : نہیں، نہیں۔ بات تو سمجھا کرو میر۔ Please give me that book
- اسلم : Don't mention
- روبی : بابا میں کہہ رہی ہوں۔ Please give me that book
- اسلم : ہاتھ کا اشارہ بھی تو دیکھو۔ ہاں یہ۔ بس یہ کتاب مجھے دے دو۔ یہی میں کہہ رہی تھی۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے Thanks
- اسلم : Sorry
- روبی : پھر وہی Sorry میں کہہ رہی ہوں Thanks یعنی شکر یہ۔ اب اس کا

جواب دو Thanks

اسلم : اس کا جواب I don't mind

روبی : نہیں مسٹر اسلم یہ تو؟ Will you smoke یا Will you take a

cup of tea یا Would you like some cold drink؟

جواب ہے۔ میں کہہ رہی ہوں Thanks-Thanks

اسلم : Thanks ہاں ٹھیک ہے۔ Don't mention

روبی : شاباش۔ اسی طرح پہلے سوچا کر د پھر جواب دیا کر۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ

اگر تم راستہ چلتے میں کسی سے ٹکرا جاؤ۔ جیسے کوئی لینڈی آرہی ہے اور تم

اس کے پاس سے گزرے اور اس کا راستہ ٹک گیا تو تم کیا کہو گے۔

اسلم : میں کہوں گا Thanks

روبی : نہیں۔ اس موقع پر کہنا چاہیے Sorry۔ اچھا یہ بتاؤ صبح کے سلام کو کیا

کہتے ہیں۔

اسلم : Friday

روبی : Friday صبح کے سلام کو Friday کہتے ہیں؟ بھلا جمعہ کو کیا کہتے ہیں۔

اسلم : جمعہ کو۔ جمعہ کو کہتے ہیں؟ How do you do؟

روبی : نہیں یاد ہوا کچھ۔ اب میں پھر محنت کروں گی۔ اچھا آپ جا کر اپنی

کتاب اٹھائیے اور سبق یاد کیجیے، جائے میں ابھی آکر سنتی ہوں۔

نیر : کمال کر رہی ہیں آپ مس روبی۔ اتنے ہی دنوں میں آپ نے اسلم کو کیا

سے کیا بتا دیا۔

روبی : میں اور کیا کروں۔ دن بھر تو سر کھپاتی ہوں۔ مگر دماغ تو ہے ہی نہیں

بیچارے کے پاس۔

نیر

: خیر یہ تو آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ آپ کے سوالوں کا جواب غلط ضرور دیا
مگر میں تو یہ اندازہ کر رہی تھی کہ اس کو اتنی جلدی انگریزی کے لفظ اور
جملے کیسے یاد ہو گئے۔ مجھے تو یہ بھی اُمید نہ تھی۔

روبی

: جی نہیں کچھ دنوں میں وہ صحیح جگہ پر صحیح جملے بھی بولنے لگے گا۔ میں زیادہ
توجہ زبان پر نہیں دے رہی ہوں بلکہ میز سر سکھانے پر فی الحال میری
توجہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس وقت وہ کس طرح آپ کے سامنے
جھک کر گیا ہے۔

نیر

: نہیں مس روبی، مجھے اب اسلم کی طرف سے کوئی فکر نہیں ہے۔ میری
توقع سے بہت زیادہ آپ نے اتنے ہی دنوں میں اس کی اصلاح کر دی
ہے۔ میں تو آپ کے اسی کمال کی قائل ہو گئی تھی کہ آپ نے اس کو کنگھا
کرنا اور بال بنانا کتنی جلدی سکھا دیا۔

روبی

: پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹیبلٹ کی مشق جتنی مشکل تھی اس کے لیے
میرا ہی دل جانتا ہے۔ مگر آج دیکھا آپ نے۔

نیر

: کہہ تو رہی ہوں کہ آپ ہر روز مجھ کو کوئی نئی بات دکھا کر پہلے سے زیادہ
متحیر کر دیا کرتی ہیں۔

روبی

: خیر یہ تو ٹھیک ہو ہی جائیں گے مسٹر۔ مگر ان کی بھی کوئی خبر ہے جن کے
لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

نیر

: مجھے ان کی نہ کوئی خبر ہے نہ میں ان کی خبر رکھنا چاہتی ہوں۔
بس ذرا خبر لینا چاہتی ہوں۔

روبی

: کمال کی باتیں کرتی ہیں آپ بھی مس روبی۔ میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا
کہ باوجود کرچین ہونے کے آپ اُردو اتنی اچھی کیسے بول لیتی ہیں۔

آپ کو تو آنے مانگتا ہے اور جانے سکتا ہے قسم کی زبان بولنا چاہیے تھی۔

روبی : یہ زبان تو میں نے کبھی بولی ہی نہیں۔ آپ کو معلوم نہیں شاید، میری مدر بھی گورنس تھیں اور ان کے ساتھ ہی مجھ کو ایسے گھرانوں میں رہنے کا موقع ملا جہاں اردو بولی جاتی تھی۔ میری مدر کی زبان شروع شروع میں یہی تھی، کس مالک جانے مانگتا ہے۔ بڑا نٹ کھٹ بچہ ہے۔ کدر جانے سکتا ہے۔

نیر : مجھ کو تو آپ سے بھی یہی امید تھی۔

روبی : جی نہیں۔ میری مدر کی زبان بھی پھر یہ نہیں رہی اور میں نے تو باقاعدہ اردو پڑھی ہے۔ پھر میں یہ انگریزی میں اردو زبان کیسے بولوں۔ مگر بی بی آپ ہیں بڑی چالاک، یہ ذکر چھیڑ کر وہ بات ٹال گئیں جو میں پوچھ رہی تھی۔

نیر : نہیں مس روپی میں نے کوئی بات ٹالی نہیں ہے، مگر یہ ذکر ہے بہت تکلیف دہ۔ آپ کو میں بتا چکی ہوں کہ مسعود کے لیے میری کتنی معصوم اور نا سمجھ امیدیں جوان ہوئی تھیں اور ان امیدوں کے ساتھ مسعود نے کیا سلوک کیا۔

روبی : یہ مرد سب کے سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔

نیر : ہاں ٹھیک ہے، آپ اپنے ہی قصے لے لیجیے۔ لارنس نے جو سلوک آپ کے ساتھ کیا ہے اس کو آپ شرافت یا انسانیت کہہ سکتی ہیں۔

روبی : مگر دیکھیے نا۔ لارنس کے اس سلوک کے بعد میری محبت تو نفرت سے بدل گئی۔

نیر : تو کیا آپ کے خیال میں مجھے مسعود سے نفرت نہیں ہے۔ میں اس کو

انتہائی ابن الوقت، خود غرض اور احسان فراموش سمجھتی ہوں۔

روبی : مگر آپ کو مسٹر مسعود سے نفرت نہیں ہے۔

نیر : نہیں مس روپی۔ مجھ پر یہ الزام نہ لگائیے۔ مجھے واقعی مسعود سے شدید نفرت ہے۔ اس کا خیال یا اس کا ذکر آتے ہی مجھے ایسا غصہ آتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں نے اس غصے سے پاگل ہو ہو کر بے چارے اسلم کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جس پر میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

روبی : بی بی۔ اپنے کو دھوکہ نہ دیجیے۔ یہی ثبوت ہے اس بات کا کہ آپ مسعود سے نفرت نہیں کرتیں البتہ محبت جو پھول کی طرح کھلنا چاہتی تھی شعلوں کی صورت میں بھڑک اٹھی ہے۔ یہ آگ بھی نفرت کی نہیں بلکہ محبت کی آگ ہے۔

نیر : یہ غلط ہے۔ مس روپی میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ آپ غلط سمجھی ہیں۔ مجھے مسعود سے ان حالات میں محبت تو ہو ہی نہیں سکتی۔

روبی : اچھا ایک بات بتائیے۔ آپ اسلم کے لیے اتنی محنت کیوں کر رہی ہیں؟

نیر : تاکہ وہ مہذب بن کر میرے ساتھ میری سوسائٹی میں جگہ پاسکے۔

روبی : اپنی سوسائٹی میں اسلم کو آپ کیوں پیش کرنا چاہتی ہیں۔ کیا صرف اس لیے نہیں کہ آپ کی اور مسٹر مسعود کی ایک ہی سوسائٹی ہے اور آپ اپنے ساتھ اسلم کو رکھ کر مسٹر مسعود کو جلانا چاہتی ہیں۔

نیر : جلانا نہیں بلکہ آئینہ دکھانا چاہتی ہوں کہ تمہاری حیثیت بھی اس خانہ بدوش سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ میرے باپ نے تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر تم کو آج اس قابل بنایا ہے کہ تم بھی اپنے کو آدمی سمجھ رہے ہو

حالانکہ یہ تمھاری کوئی ذاتی خصوصیت نہ تھی بلکہ تم کو وہ ماحول مل گیا تھا جس نے تم کو اس طرح نکھار دیا جس طرح یہ اسلم نکھرا ہوا نظر آ رہا ہے۔

روبی : بی بی۔ یا تو آپ مجھ کو غلط سمجھا رہی ہیں یا خود اپنے کو آپ نے ایک غلط بات سمجھا رکھی ہے۔ اسلم کی اس تربیت اور اس تربیت میں آپ کے اس انہماک کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ جس طرح طلعت کو ساتھ رکھ کر وہ آپ کو جلا رہے ہیں اسلم کو ساتھ رکھ کر آپ ان کو جلائیں۔

نیر : ہاں میں جموٹ نہ بولوں گی، یہ بھی ایک جذبہ ہے۔
روبی : یہ بھی ایک جذبہ ہے نہ کہیے بلکہ یہی ایک جذبہ ہے کہیے اور یہ اس لیے محبت کی جھلکی نکھار رہا ہے کہ آپ مسر مسعود کی طرف سے ایک بے چینی میں مبتلا ہیں۔ آپ ان کو بھول نہیں سکتیں۔ آپ ان کو صبر نہیں کر سکتیں آپ.....

نیر : مس رد بی۔ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کہیے کہ جس شیریں یادگار کو میں تلخ بنانے کی کوشش کر رہی ہوں وہ پھر اپنی تلخیاں چھوڑ دے۔

روبی : یہ..... یہ..... یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ مگر بی بی ذرا بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ جو سزا آپ مسعود کو دینا چاہتی ہیں اس کا مسعود پر کیا اثر ہوگا۔ آپ تو اپنی دل کی لگی سے مجبور ہیں مگر وہ تو آپ سے محبت نہیں کرتے کہ آپ ان کو جلائیں اور وہ جل جائیں۔

نیر : جی نہیں، مجھ کو یہ معلوم ہے کہ مسعود اپنے کو دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ دنیا میں کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتا اور اس کو اپنی محبت کا اسی وقت اندازہ ہوگا جب وہ اسلم کو میرے ساتھ دیکھ کر اپنی روح میں ایک کرب پائے گا۔ اس کی نیندیں بھی میری طرح اڑیں گی۔ اس کی ہر کروٹ

میں بھی کانٹے بچھ جائیں گے۔ اور اس کو بھی یہ دنیا ایک دکھتا ہوا جہنم محسوس ہوگی۔

روبی : شاید ایسا ہو سکے..... مجھے تو یقین نہیں بی بی۔
نیر : جی نہیں، یہی ہوگا اور پھر میں تہقہ لگاؤں گی۔ اپنی فتح کے پرچم اڑاؤں گی۔ اسلم کو اس کے لیے اور بھی صبر آزما بناؤں گی۔ وہ جتنا جتنا بے قرار ہوگا اتنا ہی مجھ کو سکون حاصل ہوگا۔

روبی : معاف کیجیے گا، میرے خیال میں تو یہ کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ البتہ اگر طلعت یہ کرتی جو آپ کر رہی ہیں تو شاید مسعود کا وہی حال ہوتا جو آپ سمجھ رہی ہیں۔

نیر : (آتے ہوئے) مس صاحب ہلدی چلیے۔ اسلم نے دوات اپنے اوپر گرا کر سارا پتلون غارت کر کے رکھ دیا۔

روبی : اوہ..... ایڈیٹ!
نیر : مس رد بی ڈائنے گا نہیں، غلطی سے گر گئی ہوگی۔ ٹھہریے میں بھی آرہی ہوں۔

نیر : (جاتے ہوئے) ہم بولنے والے کون۔ پر جانوروں کو آدمیوں کے کپڑے پہنانے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ کتنا قیمتی پتلون تھا۔

روبی : (قریب آتے ہوئے) یہ کیا کیا آپ نے۔ چچ چچ چچ۔ سارا پتلون خراب کر دیا تا۔

اسلم : دوات خود ہی گر پڑی ایک دم سے۔
نیر : خیر کوئی بات نہیں۔ میرا اس کو تازہ دودھ سے فوراً صاف کر دو۔ دودھ سے روشنائی اتر جاتی ہے۔

روبی : میں خود صاف کرتی ہوں۔ میرا تم دودھ لاؤ۔
 بیرا : (جاتے ہوئے) ناک میں دم کر دیا ہے اس رنگروٹ نے اور بھی۔ اور
 پہنائے جائیں اسے ریشمی پوشاکیں۔ اور پھر یہ لاڈیہ ڈلار۔ واہ رے
 زمانے۔

مس روبی نے نیر کے اس آتش فشاں جنوں کو تو سر کر دیا تھا جس کی بدولت
 اسلم کی ہر وقت شامت آتی رہتی تھی مگر اس خوش فہمی کو باوجود انتہائی کوشش کے دور نہ
 کر سکی کہ اسلم کو دیکھ کر اور اسلم کے ساتھ اس کے خوش سلوک کو دیکھ کر مسعود آگ کے
 انگاروں پر لوٹے گا۔ مس روبی نہایت صحیح نتیجے پر پہنچی تھی کہ مسعود بھلا کیوں جلنے لگا،
 مگر نیر کی اس خود فریبی کا کیا علاج کہ اس کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اور یہ دن اس کے
 خیال میں روز بروز اس کے قریب آرہا تھا..... مگر آج مس روبی نے جو چند صاف
 صاف باتیں اس سے کی تھیں ان کا مس روبی کو تو اس نے جواب دے دیا تھا مگر خود
 تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اُن ہی خیالات میں گم ہو جایا کرتی تھی۔ چنانچہ اس
 وقت بھی مس روبی تو دودھ سے پتلون صاف کرتی رہیں اور نیر بیٹھے ہی بیٹھے ان ہی
 خیالات میں گم ہو گئی اور چونکی تو اس وقت چونکی جب مس روبی نے ایک دوسرا پتلون اسلم
 کے لیے نکال کر اس کو دیتے ہوئے کہا:

روبی : اب اس کو پہن کر اس نہ مارنا مسٹر۔ یہ بہت ہی قیمتی کپڑے کا پتلون
 ہے۔

نیر : مس روبی یہ پتلون نہ دیجیے، کوئی اور دے دیجیے۔ بیرا یہ پتلون مس روبی
 سے لے کر میرے کمرے میں رکھ آؤ۔

بیرا : یہ پتلون تو شاید چھوٹے صاحب۔ میرا مطلب یہ کہ.....

نیر : بکو اس بند کرو۔ تم لوگوں کو خواہ مخواہ کی باتیں کرنے کا نہ جانے کیا شوق
 ہے۔ لاؤ مجھ کو دو میں خود لیے جاتی ہوں۔
 اور یہ کہہ کر نیر نے وہ پتلون بیرے کے ہاتھ سے لے لی اور وہاں سے چلی
 گئی۔ اس کو جاتا ہوا مس روبی نے خاص نظروں سے دیکھا اور جب وہ کمرے میں
 چلی گئی تو بیرے سے پوچھا۔

روبی : چھوٹے صاحب سے تمہارا مطلب کیا تھا۔
 بیرا : آپ نہیں جانتیں ان کو۔ آپ کے آنے سے بہت پہلے وہ یہاں سے
 جا چکے ہیں۔

روبی : نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ تم مسٹر مسعود کو تو نہیں کہہ رہے ہو؟
 بیرا : جی ہاں وہی۔ مگر آپ کو کیسے معلوم۔ کیا آپ ان کو جانتی ہیں؟
 روبی : میں نے ان کا نام سنا ہے۔ اچھا دیکھو بیرا۔ کل میرے ساتھ بیٹھ کر اسلم
 کے کپڑوں میں سے مسٹر مسعود کے تمام کپڑے الگ کرالینا۔ میں نہیں
 چاہتی کہ ان کا کوئی کپڑا اسلم کے استعمال میں آئے۔

بیرا : مس صاحب چاہتا تو میں بھی یہی تھا مگر میری سنا کون ہے۔ البتہ آج
 یہ نئی بات ہوئی ہے کہ خود سرکار نے اس پتلون کو اسے پہننے نہ دیا۔ نہ
 جانے یہ کیا قصہ ہے۔

مس روبی نے اس کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ وہ بیرے کو کیا بتائیں کہ
 اب نیر کے دل سے رفتہ رفتہ وہ نفرت کا ملمع اتر رہا ہے جو محبت پر چڑھایا گیا تھا اور وہ
 خود نہیں چاہتی کہ مسعود کی کوئی چیز اسلم کے استعمال میں آئے۔ وہ لاکھ کہے کہ اس کو
 محبت نہیں ہے مگر خدا بچائے اس محبت سے جو نفرت کا روپ دھار لے۔



ہلکے موتیارینگ کے بُش شرٹ، دودھ سے زیادہ سفید مکھن زین کا بے سِلن پتلون، سفید موزے اور سفید ہی جوتا پہنے جو خوش وضع جامہ زیب نوجوان اس وقت نواب ممتاز ولدہ کے ایوان کے سبزہ زار پر نہایت وقار سے ٹہل ٹہل کر سرگرمی پل رہا ہے، کون پہچان سکتا ہے کہ یہ وہی خدا بخش ہے جس کو مسعود کی ضد پر نیر اپنے یہاں لائی اور جس کو اسلم یا بقول مس روپی کے مسٹر اسلم بنانے کے لیے اس نے کیا کیا جتن کئے، اور واقعی یہ یقین آنے کی بات بھی نہیں کہ ایک خالص جا ننگو اس قدر جلد اپنی ہیئت ہی بدل دے گا۔ اب اس کو خواہ نیر کی مجنونا مدد کو شش کا نتیجہ کیسے یا مس روپی کی تربیت کی کرامت..... مگر یہ واقعہ ہے کہ آج کے اسلم کو دیکھ کر کسی کو یہ یقین دلانا آسان نہیں کہ کل یہی حضرت خدا بخش رہ چکے ہیں اور نہایت اعلیٰ درجے کے خدا بخش۔ لباس اور وضع قطع میں اصلاح تو خیر پہلے ہی دن ہو گئی تھی مگر یہ لباس مدتوں ان حضرت پر تہمت نظر آتا رہا اور ان کو دیکھنے والا زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ ”حیلا زشت است کہ بہ آب زرنوشت“ مگر اب تو ان کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ چہرے پر وحشت کی جگہ ایک دبدبہ ہے، چال ڈھال میں ایک خود اعتمادی ہے اور حیرت ہوتی ہے ان حضرت کے چہرے پر غور و فکر کے آثار دیکھ کر کہ گویا یہ بھی کچھ سوچ سکتے ہیں۔ مگر وہ تو اس طرح گہری فکر میں محو ہیں گویا کسی نہایت ہی پیچیدہ مقدمے کا جناب کو

فیصلہ لکھنا ہے۔ یا کوئی اہم سیاسی دستور مرتب فرما رہے ہیں ورنہ کم سے کم غزل تو کہہ ہی رہے ہیں۔ اللہ ری محویت کہ آپ کو مس روپی کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی اور جب اس نے مخاطب کیا تو آپ ایک دم چونک پڑے۔

اسلم : مجھے آپ کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی مس روپی۔

مس روپی : آج کل بہت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہیں آپ مسٹر اسلم۔

اسلم : جی ہاں مجھے خود محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں کھو گیا ہوں۔ جیسے مجھے کسی نے خود مجھ ہی سے چھپا دیا ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔

مس روپی : بڑی فلسفیانہ باتیں کرنے لگے ہیں آپ تو۔ آپ مسٹر اسلم ہیں اور کیا ہوتے۔

اسلم : مس روپی آپ خواہ کچھ بھی کہیں مگر میں وہ نہیں ہوں جو نظر آ رہا ہوں۔ میں سب کچھ سمجھ سکتا ہوں مگر خود اپنے کو سمجھنے سے مجبور ہوں۔

مس روپی : آپ ان باتوں پر غور ہی کیوں کرتے ہیں۔

اسلم : اس لیے غور کرتا ہوں کہ مجھے غور کرنے کے قابل بنادیا گیا ہے۔ آپ نے مجھے غور کرنے کے قابل بنایا ہے۔ نیر نے مجھے غور کرنے کے قابل بنایا ہے۔ اب میری آنکھیں کھولنے کے بعد آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں خود اپنے کو نہ دیکھ سکوں۔

مس روپی : نہیں، نہیں۔ آپ ضرور دیکھیے اپنے کو۔ آپ کو یہی تو معلوم کرنا ہے کہ اس گھر میں آپ کی حیثیت کیا ہے..... آپ اس گھر کی مالکہ کے دوست ہیں۔

اسلم : میں نے اپنے کو یہ یقین دلانے کی بھی کوشش کی مگر میرا خیال ہے کہ یہ

سے ملایا گیا کہ گویا میں ہی نیر کے لیے سب کچھ ہوں۔ میری تعریفوں کے بل باندھے گئے۔ میری ہر بات پر نیر پھول کی طرح کھلی جاتی تھیں۔ پھول پر یاد آیا، گل دان سے ایک پھول نکال کر میرے کوٹ میں اس طرح لگایا کہ میں جھوم اٹھا۔ یا تو یہ شورشوری یا یہ بے نیکی کہ اب جو کرل شیخ وغیرہ گئے ہیں تو میں نے صرف یہ پوچھا کہ آپ آخر مجھ کو کانٹوں میں کیوں گھسنتی ہیں تو نہایت سپاٹ انداز سے ڈانٹ دیا کہ بکومت، اور اس طرح چل دیں کہ گویا صاحب سلامت ہی نہ تھی۔

مس روہی: (ہنس کر) اچھا تو آپ یہ سمجھتے تھے کہ آپ کے کوٹ میں پھول لگا کر نیر بی بی گلے کا بار ہی بن گئی ہیں۔

اسلم: تو پھر یہ سب کیا تھا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ نیر کے دوستوں کے تمام حلقے میں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ میں گویا..... یعنی میرا مطلب ہے کہ.....

مس روہی: سوسائٹی میں آپ منگیتر سمجھے جا رہے ہیں یعنی نیر بی بی کے مرکب انتخاب۔ یہ درست ہے۔

اسلم: حالانکہ یہ واقعہ نہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے، آپ بھی جانتی ہیں کہ یہ واقعہ نہیں ہے۔

مس روہی: یہ بھی درست ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے۔

اسلم: مگر مس روہی میں بھی تو آخر انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی آخر دل ہے۔

مس روہی: باپ رے باپ، تو کیا تمہارے دل میں کچھ ہونے لگا ہے۔ تمہارے سینے میں دل ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ یہ دل کیسے پیدا ہو گیا تمہارے سینے میں؟

غلط ہے۔ میں اس گھر کی مالکہ کا دوست نہیں ہوں۔

مس روہی: یہ آپ کو کیسے خیال ہوا؟

اسلم: جو بات آپ کو خود معلوم ہے وہ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ نیر مجھ کو اپنا بہترین دوست بنا کر سب کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ سب کے سامنے مجھ سے ایسی میٹھی باتیں کرتی ہیں کہ میں حیران رہ جاتا ہوں اور جب تنہائی میں ان کا خشک، بے تعلق اور بے گانہ رنگ دیکھتا ہوں تو پھر اپنی اوقات پر آ جاتا ہوں۔

مس روہی: خدا خیر کرے، آپ تو کچھ مچلے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ بی بی کی میٹھی باتوں سے خوش ہونا اور پھر خشک برتاؤ سے رنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگنا یہ آثار تو اچھے نہیں۔

اسلم: یہ آثار اچھے ہوں یا برے مگر یہ تماشا کیا ہے آخر۔

مس روہی: اسلم صاحب آپ صرف اتنا سمجھ لیجیے اور یہی سمجھ لیتا آپ کے لیے کافی ہے کہ آپ ایک بڑے گھر میں بڑے آدمیوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ لباس، یہ ٹھانڈ اور یہ شان و شوکت صرف اس بات کا معاوضہ ہے کہ آپ اپنے متعلق کچھ نہ سوچیں۔

اسلم: میں اپنے متعلق بھی کچھ نہ سوچتا مس روہی مگر میں بھی آخر انسان ہوں۔

مس روہی: بابا تم انسان نہیں ہو بلکہ کسی وجہ سے انسان بنائے گئے ہو۔ اب کیوں مجھ سے صاف صاف سننا چاہتے ہو۔

اسلم: مجھ کو یہ شکایت نہیں ہے کہ مجھے انسان کیوں بنایا گیا ہے۔ شکایت یہ ہے کہ انسان بنا کر اب کھلونا کیوں بنایا جا رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کل میرے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ کرل شیخ سے کل مجھے ملایا گیا اور اس انداز

اسلم : کمال کرتی ہیں آپ، یعنی ایک خوب صورت لڑکی محبت چھڑ کے۔ عشق بگھارے۔ سب کے سامنے لگاؤ کی باتیں کرے اور میرے دل کو کچھ نہ ہو.....

مس روہی : مرے اب تم مسٹر بے موت۔ اگر نیر بی بی کو خبر بھی ہوگئی تو مر غائب تائے جاؤ گے۔ اپنے حواس میں رہو۔

نیرا : (آتے ہوئے) مس صاحب بی بی یاد کرتی ہیں۔

مس روہی : کیا کوئی آیا ہے؟

نیرا : کچھ لوگ آئے تو ہیں۔ اب آپ جائیں تو پتہ چلے کہ چائے کب لگائی جائے گی۔

نیر کے یہاں آج کرنل شیخ اور چند دوسرے احباب کی چائے تھی۔ کرنل شیخ سے اسلم کو پہلے بھی ملایا جا چکا تھا اور آج چائے پران کو بلانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ ذرا تفصیلی ملاقات ہو سکے گی۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ کرنل شیخ دراصل مسعود کے دوست ہیں۔ ساتھ کے پڑھے ہوئے اور ہر وقت کے اٹھنے بیٹھنے والے۔ نیر کو چوں کہ معلوم تھا کہ کرنل شیخ مسعود سے اب بھی برابر ملتے رہتے ہیں اس لیے مسعود تک اسلم کی خبریں پہنچا کر اسے جلانے کے لیے وہ بار بار اسلم کو کرنل شیخ سے ملاری تھی۔ ادھر کرنل شیخ کو مسعود سے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ اسلم صاحب ہیں کیا۔ مگر وہ ایک ہی گھٹا ہوا۔ اس نے نیر کو ہوا بھی نہ لگنے دی کہ مسعود نے اسلم کا اصل تعارف اس سے کرا دیا ہے اور اسلم کا سارا حدود اور بعد کرنل شیخ کو معلوم ہو چکنے کے بعد اب اگر حیرت تھی تو صرف یہ کہ مسعود نے اس کو یہ بتایا تھا کہ یہ اسلم ابھی سات آٹھ ماہ پہلے تک نہایت بے مرمت قسم کا جانور تھا اور کرنل شیخ اب اس کو نہایت ترش ترشایا ہوا مہذب

انسان دیکھ رہے تھے، جو نہ صرف باقاعدہ باتیں کر سکتا تھا بلکہ جس کے چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ اس کو اپنی موجودہ حالت کا احساس بھی ہے۔ ایک جاہل کو پوری توجہ کے ساتھ اتنا پڑھایا بھی جاسکتا ہے اور اسی مدت میں پڑھایا جاسکتا ہے۔ ایک گنوار کو اسی مدت میں تربیت دے کر مہذب بھی بنایا جاسکتا ہے، مگر کرنل شیخ کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ یہ لطیف احساسات اس میں کہاں سے پیدا ہو گئے۔ طوطے کو خواہ کتنا ہی پڑھایا جائے مگر وہ طوطا رہتا ہے مگر اسلم کو دیکھ کر کرنل شیخ کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہ آسکی کہ اس میں وہ باتیں کہاں سے آگئیں جو تعلیم اور تربیت سے حاصل نہیں ہوتیں۔ کرنل شیخ سنجیدگی سے اس معصے کو حل کرنا چاہتے تھے اور ان کو اسلم کے معاملے میں کچھ دال میں کا لائفلر آ رہا تھا..... اور یہی وجہ تھی کہ وہ ایک مرتبہ ملنے کے بعد اس سے بھر ملنا چاہتے تھے چنانچہ نیر نے آج ان کو باقاعدہ چائے پر مدعو کر لیا تھا اور وہ یہاں آنے کے بعد اسلم سے ملنے کے لیے بے قرار تھے۔

کرنل شیخ : بھی نیر تم کو معلوم ہے کہ میں تم سے زیادہ اسلم صاحب سے ملنے آیا ہوں اور تم نے ان ہی کو غائب کر رکھا ہے۔ اس کا اطمینان کر لو کہ ان میں جو لعل جڑے ہیں وہ میں ہرگز نہ توڑوں گا۔

نیر : میں خود حیران ہوں وہ گئے کہاں۔ عجیب من موچی آدمی ہیں۔ نہایت سخت قسم کے آرٹسٹ۔ اگر کسی پھول کی خوش رنگی نے ان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تو گھنٹوں اسی میں کھوئے رہیں گے۔ دیکھیے ان کی سراغ رساں آگئیں ان سے پوچھتی ہوں..... مس روہی اسلم کہاں ہیں؟

مس روہی : وہ تو ادھر لان پر ٹہل رہے ہیں۔
کرنل شیخ : ہاں صاحب یہ بھی کوئی بات ہے بھلا کہ خانہ بہ مہمان گزاشت یعنی ہم

ان سے ملے آئے ہیں اور وہ لان پر ٹہل رہے ہیں۔ لیجیے رفیق اور جلال بھی آگئے۔

رفیق : آداب بجالاتا ہوں۔

جلال : کیوں حضور کرل صاحب بہادر میں نہ کہتا تھا کہ سب سے پہلے آپ پہنچیں گے۔ نیر یہ کس وقت آئے ہیں بھلا۔

نیر : دس منٹ ہوئے ہوں گے۔

رفیق : پھر تو کوئی بات نہیں۔ ہم لوگوں کو اندیشہ تھا کہ یہ شام کی چائے کے لیے لُچ پر نہ پہنچ جائیں۔ بہت پیشگی قسم کے آدمی ہیں۔ اور بھی کہاں ہیں وہ مہمان خاص۔

جلال : مہمان یا میزبان کی قسم کی کوئی چیز۔

کرل شیخ : جینھو تو سہی وہ بھی آتے ہیں۔

نیر : میں خود لاتی ہوں ان کو۔ مس روہی ذرا بات سنئے۔

نیر اور مس روہی کے جانے کے بعد ادھر احباب میں یہ کچھڑی پکنا شروع ہوگئی کہ سب بغور اسلام کا مطالعہ کر کے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کریں کہ اسلام دراصل ہیں کیا۔ ادھر مس روہی نے نیر کے اسلام تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ بتا دینا ضروری سمجھا کہ اسلام کا آج موڈ کیا ہے اور کہیں یہ موڈ آج کی پارٹی کا ناس نہ مار دے۔

نیر : کدھر ہیں اسلام؟

مس روہی : وہ تو خیر ادھر ہیں مگر بی بی آج تو ہماری بی بی ہم ہی سے میاؤں کہنے لگی ہے۔

نیر : کیا مطلب۔ کیا کچھ ڈانٹ دیا ہے آپ کو۔

مس روہی : مجھ کو ڈانٹ دیتے تو کوئی پروا نہ تھی مگر ان پر تو نہایت خطرناک دورہ پڑا ہے۔ وہ تو کچھ آپ کی خوب صورتی وغیرہ پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے ہیں۔

نیر : کیا..... یہ کیا مذاق ہے۔ آپ کو بھی جو سوچھتی ہے ایسی ہی سوچھتی ہے مس روہی۔

مس روہی : میں سچ کہہ رہی ہوں بی بی۔ وہ تو کچھ بڑے عاشق زار بنے ہوئے سبزہ زار پر ٹہل رہے ہیں۔ میں گئی تو بگے مجھ سے سمجھ داری کی باتیں کرنے کہ میں نیر کے دوستوں کے حلقے میں جو کچھ سمجھا جا رہا ہوں وہ کیوں نہیں ہوں۔

نیر : یہی ڈر تھا مجھے کہ مینڈکی کو زکام کی شکایت نہ ہو جائے۔

مس روہی : بہت سخت زکام ہوا ہے وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میرے سینے میں بھی آخر دل ہے۔

نیر : چلو چھٹی ہوئی..... میں پوچھتی ہوں شامت تو نہیں آئی ہے ان حضرات کی۔

مس روہی : اول تو اس میں اُس بے چارے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ دوسرے یہ وقت غصہ کرنے کا نہیں ہے ورنہ آپ کی پارٹی ناس ہو کر رہ جائے گی۔ اس وقت تو اسلام کو بھلا پھسلا کر کام نکالے۔

نیر : خیر اتنی بے وقوف تو میں بھی نہیں ہوں کہ اس وقت بات بڑھاؤں مگر مس روہی اگر اسلام کا ایک اس قدر ہوشیار ہو گیا ہے تو یہ قصہ کتنے دن چل سکے گا۔

مس روہی : ان باتوں پر بعد میں غور کیجیے گا، فی الحال تو ان کو لے جائیے پارٹی

میں..... وہ دیکھیے تشریف لارہے ہیں۔

نیر : (آواز دے کر) اسلم۔ کہاں پھر رہے ہو۔ میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں
تحسین۔

اسلم : (قریب آتے ہوئے) میں تو یہیں تھا۔ ادھر ٹہل رہا تھا۔

نیر : کرل شیخ، رفیق، جلال سب آپکے ہیں۔ تم کو پوچھ رہے ہیں۔

اسلم : تو چلیے میں حاضر ہوں۔

نیر : پھر تم نے اس قدر فرماں بردار اور سعادت مند بننے کی کوشش کی۔ یہ کیا

ہوتا جا رہا ہے تم کو اسلم..... میں تم کو صرف بے تکلف دوست دیکھنا
چاہتی ہوں۔

اسلم : آپ دیکھنا نہیں چاہتی ہیں دوسروں کو دکھانا چاہتی ہیں کہ میں آپ کا
نہایت بے تکلف دوست ہوں۔

نیر : فضول باتیں نہیں کیا کرتے اسلم۔ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ میں بھی کچھ
مجبور ہو سکتی ہوں۔

اور اسلم ایک مرتبہ پھر اسی ایک فقرے سے وہ تمام تمنیاں بھول گیا جو اس کو
اعمدی احمد بھنوت اور انقلاب پر اُکسار ہی تھیں۔ اس نے نیر کی مجبوری، وہ مجبوری
جس کی طرف اس نے ایک مبہم سا اشارہ کیا تھا اس کی آنکھوں میں دیکھ لی اور وقتی طور
پر سہمی مگر اس کا غم غلط ضرور ہو گیا بلکہ وہ کچھ منفعل سا ہو گیا کہ اُس نے نیر کے متعلق
ایسی بات سوچی ہی کیوں۔ وہ نیر کے ساتھ اس محفل کی طرف روانہ ہوا جہاں وہی ان
سرگوشیوں کا موضوع تھا جو احباب کے درمیان جاری تھیں۔

کرل شیخ : نہیں بھئی۔ تو نا مکر، سے کہ یہ اسلم وہی ہو جو ظاہر کیا گیا ہے۔

جلال : گویا آپ کا خیال یہ ہے کہ اسلم دراصل سب کو بے وقوف بنا رہا ہے۔

رفیق : ممکن ہے وہ بے وقوف نہ بنا رہا ہو خود نیر بن رہی ہو۔

کرل شیخ : سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ تعلیم اور تربیت وہ سب کچھ کسی کو نہیں
سکھا سکتی جو وہ ایک ایک سیکھ گیا ہے۔

جلال : وہ لوگ آ رہے ہیں شاید۔

نیر : (آتے ہوئے) دیکھیے میں نے کہا تھا کہ آرٹسٹ کسی رنگین تصور میں غم

ہوگا۔ جناب سبزہ زار پر سبزہ بے گانہ سے اس کی بے گانہ وشی کی شکایت
کر رہے تھے۔

کرل شیخ : تشریف لائے اسلم صاحب۔ تعارف کی چنداں ضرورت نہیں آپ
سب ہی سے مل چکے ہیں۔

اسلم : جی ہاں نیاز حاصل ہو چکا ہے۔ معاف کیجیے گا مجھے آپ حضرات کے
تشریف لانے کی خبر نہ ہوئی۔

نیر : خبر اس کو ہوتی ہے جو باخبر رہنا چاہے۔

کرل شیخ : بھی اسلم صاحب معاف کیجیے گا اس جسارت کو، آپ کے متعلق یہ تو طے
ہے کہ بڑا شاعرانہ مزاج پایا ہے اور شبہ یہ ہے کہ شاید کچھ کہتے بھی
ہوں۔

نیر : کون یہ؟ ان کو تو شعر و شاعری سے اس قدر نفرت ہے کہ میں کیا کہوں
کہتے ہیں کہ جو کہہ دیا جائے، جو ادا ہو جائے اور جو الفاظ کی شکل میں
ڈھل جائے وہ شعر ہو ہی نہیں سکتا۔

رفیق : یہ کیا بات ہوئی اسلم صاحب ذرا وضاحت فرمائیے۔

نیر : ان کا مطلب یہ ہے کہ.....

کرنل شیخ : بھئی ہم اسلم صاحب سے پوچھ رہے ہیں اور بول رہی ہیں بیچ میں آپ۔

جلال : جی ہاں گویا اسلم صاحب کی ترجمان خاص ہیں آپ۔

رفیق : آپ خود بتائیے اسلم صاحب۔

اسلم : میں صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ میں شعر نہیں کہتا۔

نیر : بھئی چائے کی میز پر چلیے وہیں مفصل باتیں ہوں گی۔

نیر کو اسلم کی طرف سے لاکھ اطمینان سہی مگر وہ ڈرتی ہی رہتی تھی کہ خدا جانے کس وقت وہ کیا بات کہہ بیٹھے۔ وہ ایسے ہر موقع پر دخل در معقولات شروع کر دیتی جب مخاطب براہ راست اسلم ہو۔ مگر آج تو یہ حضرات طے ہی کر چکے تھے کہ اسلم کا اچھی طرح جائزہ لیں گے۔ مگر جب اس کا حسب دل خواہ موقع نہ مل سکا تو کرنل شیخ نے اسلم کو اپنے یہاں مدعو کیا اور اس بہانے سے مدعو کیا کہ یہ خالص مردانہ پارٹی ہے۔ نیر نے اس موقع پر بھی مداخلت بے جا کی کوشش کی مگر اس کی کچھ پیش نہ گئی اور اسلم نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس پارٹی میں ضرور شرکت کرے گا۔ مگر اس وعدے کے باوجود یہ لوگ آج کی محفل میں بھی اسلم کو کچھ نہ کچھ ٹنول لینا ہی چاہتے تھے۔ جب اسلم یہ وعدہ کر چکا تو کرنل شیخ نے کہا۔

”مگر اسلم صاحب معاف کیجیے گا، یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ آپ کو شعر و شاعری سے نفرت ہے میں آپ کے تنہا جانے کے متعلق نیر کو اس وقت ایک شعر سناتا چاہتا ہوں کہ:

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے“

اسلم نے کہا۔ ”تو گویا آپ ان کو پاسبان عقل قرار دے رہے ہیں حالانکہ میں ان کو عقل بان سمجھتا ہوں۔“

نیر نے تالی بجا کر کہا۔ ”بہت خوب کہا آپ نے۔ سن لیجیے حضور کرنل صاحب بہادر گاڑی بان، فیل بان کی قسم کی چیر عقل بان آج ہی آپ نے سنی ہوگی۔

رفیق نے کہا۔ ”بہر حال اسلم صاحب ہم کو آپ کی عقل یا آپ کے عقل بان کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کل کی پارٹی میں صرف آپ کی ضرورت ہے۔“

اسلم نے کہا۔ ”میں نے تو عرض کیا کہ میں بسز و چشم حاضر ہوں۔“

نیر نے کہا۔ ”اب آپ کچے کاغذ پر لکھوانا چاہتے ہوں تو اس کا بھی انتظام کیا جائے۔“

اسی قسم کی باتوں میں آج کی یہ پُر لطف صحبت ختم ہوئی۔



ہونے تک ادھر ادھر کی باتوں کے علاوہ کوئی قابل ذکر بات نہ ہوئی۔ البتہ جب تمام مہمان رخصت ہو چکے اور کرنل شیخ کے علاوہ مسعود، طلعت اور خود اسلم باقی رہ گئے تو کرنل شیخ نے اسلم کے شانے پر ایک تھپکی دیتے ہوئے کہا:

کرنل شیخ : اب باتیں ہوں گی ذرا مزے دار۔ اب سب اپنے ہی باقی رہ گئے ہیں۔

اسلم : شکریہ آپ کا کہ آپ نے مجھ کو بھی اپنوں میں سمجھا۔
 طلعت : جی ہاں۔ مگر جو اپنے ہوتے ہیں وہ شکریہ ادا نہیں کرتے۔
 مسعود : مگر وہ بے چارے کیا کریں، تربیت ہی یہ دی گئی ہوگی۔
 شیخ : بھئی اسلم صاحب بے تکلفی معاف، آپ کو چائے پر بلانے اور تہنا بلانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ کا وجود ہم سب کے لیے معمہ بنا ہوا ہے۔
 مجھ کو، ان خاتون محترم کو اور ان حضرات کو آپ کے متعلق سب کچھ معلوم ہے کہ آپ کن حالات میں نیر کے یہاں لائے گئے ہیں۔
 طلعت : ہم لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت کے لیے نیر صاحبہ نے کیا کیا پاپڑ بنیلے ہیں۔

اسلم : مسعود صاحب آپ کو جو کچھ معلوم ہوا آپ بھی فرمادیں۔
 مسعود : مجھ کو صرف یہ معلوم ہے کہ نیر نے آپ کو سمجھنے میں احمقانہ دھوکہ کھلایا ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ آپ نے نیر کو یہ دھوکہ کیوں دیا ہے۔
 اسلم : میں سمجھا نہیں کہ دھوکے سے آپ کا مطلب کیا ہے؟
 مسعود : (ہنس کر) اسلم صاحب ہر ایک کو نیر نہ سمجھئے اور نہ ہر ایک کے پاس عقل کی اتنی کمی ہے کہ وہ آپ کی اس ناقص اداکاری پر ایمان لے آئے گا۔
 ہم نظر بازوں سے آپ اس آسانی کے ساتھ چھپ نہ سکیں گے۔

کرنل شیخ کی پارٹی میں اسلم کا تنہا جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کئی مرتبہ نیر نے ارادہ کیا کہ کوئی بہانہ تراش کر کے اسلم کو وہاں نہ بھیجے مگر مس روپی نے یہ نکتہ سمجھایا کہ کرنل شیخ کی پارٹی میں مسعود ضرور ہوں گے اور اسلم کا وہاں نہ پہنچنا ان کی کامیابی سمجھی جائے گی۔ اسلم کو اس پارٹی میں ضرور جانا چاہیے اور اس شان سے جانا چاہیے کہ مسعود کا چراغ اس کے سامنے نہ جل سکے۔ خیر یہ تو نیر بھی جانتی تھی کہ اسلم کا مسعود سے کوئی مقابلہ نہیں مگر اس نے یہ بات مس روپی کو سمجھانا ضروری نہ سمجھی اور ان دونوں نے مل کر اسلم کو اس پارٹی کی شرکت کے لیے طرح طرح سے تیار کرنا شروع کر دیا۔ کئی تو اس غریب کے رہرسل کرائے گئے۔ نیر نے مسعود بن کر اور مس روپی نے کرنل شیخ بن کر اسلم پر وہ جرح کی کہ جس کی ان کو توقع تھی اور اسلم کو جب ہر اعتبار سے اپنے نزدیک تیار کر لیا تو اعلیٰ درجے کے سوٹ میں سجا ہوا کر پارٹی کے لیے روانہ کر دیا۔

کرنل شیخ کی وہ پارٹی جو خالص مردانہ ظاہر کی گئی تھی اسلم کو ملی جلی نظر آئی جس میں علاوہ سب مردوں کے ایک خاتون بھی تھیں، جن کا تعارف اس سے یہ کرایا گیا کہ آپ آئیں طلعت ہیں اور جب اس کو مسعود سے ملا گیا تو وہ ہاتھ ملا کر ہاتھ چھڑانا بھول گیا اور دیر تک مسعود کا جائزہ لیتا رہا۔ مگر چائے کا دور چلنے تک کوئی خاص بات سوائے چند رسمی باتوں کے نہ ہوئی بلکہ چائے کا دور ختم ہونے اور مہمانوں کے رخصت

اسلم : معاف کیجئے گا میرے خیال میں آپ واقعی کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔
 طلعت : اسلم صاحب آپ بلاوجہ اپنے نقاب کے بند کس رہے ہیں۔
 مسعود : جی ہاں۔ حالانکہ آپ کا دل اس وقت گواہی دے رہا ہے کہ جن لوگوں سے آج آپ کو واسطہ پڑا ہے ان کو آسانی کے ساتھ آپ بے وقوف نہ بنا سکیں گے۔ بلکہ معاف کیجئے گا میرے خیال میں تو آسانی سے کیا بلکہ اپنی پوری کوشش کے بعد بھی اس مقصد میں آپ کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

اسلم : (نس کر) کمال ہے صاحب۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔
 کرنل شیخ : بھی چاہتے یہ ہیں اسلم صاحب ہم لوگ کہ نیر کے لیے آپ جو کچھ بنے ہیں بنے رہے، مگر ہم نیاز مندوں کو تو بتا دیجیے کہ آپ دراصل ہیں کون؟
 اسلم : مگر میں آپ کو جو کچھ نظر آ رہا ہوں اس میں آپ کو شک کیوں ہے۔
 مسعود : شک اس لیے ہے اسلم صاحب کہ آپ نے اپنی اداکاری کا پول خود کھول دیا ہے۔ آپ ایک سادہ لوح، جاہل مطلق، تہذیب اور تعلیم دونوں سے یکسر بے گانہ، ہر شعور اور ہر سلیقے سے قطعاً بے نیاز نیر کے یہاں تشریف لائے اور اپنا کردار نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ یہاں تک کہ ایک کامیاب اداکار کی طرح ہر ختی جھیلی۔ مارتک کھائی مگر اپنے کردار میں کوئی خامی پیدا نہ ہونے دی۔

طلعت : تعظیم بھی آپ نے جس طرح حاصل کی اس کی داود بٹا پڑے گی۔
 مسعود : مگر تعظیم حاصل کرنے کے بعد آپ خود اپنے کردار کو بھول گئے اور ایک دم ایسے ترشے ترشائے، ڈھلے ڈھلائے مہذب آدمی بن گئے کہ آپ کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ آپ نے وہ باتیں بھی شروع کر دیں جو تعظیم نہیں

سکھاتی، جو کسی اور سے حاصل نہیں کی جاتیں بلکہ خود اپنے خمیر میں ہوتی ہیں اور ایک تعلیم یافتہ مہذب خاندان کی روایات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

طلعت : ابھی تھوڑی دیر ہوئی رفیق صاحب نے غالب کا ایک شعر پڑھا تھا۔ آپ نے اسی زمین میں خولجہ میر درد کا ایک شعر سنا کر اپنی چغلی خود کھائی۔

اسلم : میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ اس میں چغلی کھانے کی کیا بات تھی۔
 مسعود : اسلم صاحب چغلی کی بات یہ ہے کہ میں یہ تو تسلیم کر سکتا ہوں کہ آپ واقعی بہت ذہین نکلے کہ مس روہی کی تعلیم و تربیت نے آپ کو اس قدر جلد انسان بنا دیا۔ مگر میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ مس روہی یا نیر نے آپ کو غالب کے علاوہ خولجہ میر درد بھی پڑھایا ہوگا۔

کرنل شیخ : اب وضع داری کے طور پر آپ بننے رہیں تو دوسری بات ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ چور پکڑا جا چکا ہے۔

مسعود : چور نے اپنے کو خود پکڑوایا ہے۔ اسلم صاحب کتنے طالب علم ایسے ہیں جو زندگی گزار کر بڑے بڑے امتحان پاس کر لیتے ہیں اور غالب، میر، مومن، آتش، ماتح، انیس وغیرہ کے علاوہ ان کو خولجہ میر درد پر بھی عبور حاصل ہوتا ہے۔ میں نیر کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کو خولجہ میر درد کا ایک شعر بھی یاد نہیں ہو سکتا۔

طلعت : رہ گئیں مس روہی۔ وہ بے چاری کیا جانیں خولجہ میر درد وغیرہ کو۔
 اسلم : صاحب میں ہارا آپ جیتے۔ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ ایسے خطرناک ذہنوں سے بھی مقابلہ ہوگا۔

طلعت : خطرناک ذہن تو کیا البتہ یہ کیسے کہ اتنے سادہ لوح بھی نہیں ہیں جتنی نیر ہیں۔

کرنل شیخ : بہر حال آپ یہ بتائیے کہ آپ نے یہ ڈھونگ کیا رہا ہے۔
اسلم : اگر میں کہوں کہ یہ میرا ایک ایسا راز ہے جسے میں کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا تو کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے۔

مسعود : جی نہیں۔ اس لیے کہ ہر راز کے لیے راز دار بھی مہیا کیے جاتے ہیں۔ البتہ اس بات کا ہم تینوں آپ کو یقین دلا سکتے ہیں کہ ہم آپ کے دوست ہیں دشمن نہیں اور آپ کا راز ہم پر ظاہر ہونے کے بعد ہمارا راز بن کر رہے گا۔

اسلم : میں آپ تینوں سے عموماً اور مسعود صاحب خود آپ سے خصوصاً اس قدر مرعوب ہو چکا ہوں کہ میرا خیال یہ ہے کہ اگر میں نے آپ سے یہ راز چھپانے کی کوشش بھی کی تو ناکام رہوں گا۔ آپ لوگ یقیناً یہ راز معلوم کر کے رہیں گے اور میں اپنی کوششوں میں ناکام رہنے کے علاوہ آپ کی ہمدردی اور دوستی بھی کھو بیٹھوں گا۔ لہذا میں اپنے راز کو آپ کی امانت کے سپرد کرتا ہوں۔

طلعت : اگر آپ نے ہم پر بھروسہ کیا تو ہم آپ کے اس اعتماد کا پورا احترام کریں گے۔

اسلم : یہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں، مجھے یہ اعتماد پہلے ہی ہے۔ مسعود صاحب میری کہانی کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ آپ کے محسن اور نیر کے والد خان بہادر ممتاز حسین صاحب، جو بعد میں نواب ممتاز لہ ذولہ کے نام سے ایک بڑی جاگیر کے مالک بن بیٹھے تھے دراصل اپنے وقت

کے بہت بڑے غاصب تھے۔

مسعود

اسلم

غاصب؟ نواب ممتاز لہ ذولہ اور غاصب؟
آپ حیران نہ ہوں۔ اور اپنے محسن کے متعلق ان سخت الفاظ پر برا بھی نہ مانیں۔ وہ واقعی بہت بڑے غاصب تھے۔ صرف غاصب ہی نہیں بلکہ وہ خونی بھی تھے۔ وہ میرے محبوب الخواس باپ کے قاتل تھے اور اتنی بڑی جاگیر حاصل کرنے کے لیے انھوں نے میری ماں کی زندگی برباد کی تھی۔ اور اس بے زبان دکھیا کو میرے باپ سے اُس وقت طلاق دلوائی تھی جب میں صرف چند ماہ کا تھا۔ نواب ممتاز لہ ذولہ میرے والد مرحوم کے سب سے بڑے دوست تھے اور والد مرحوم کو اُن پر اتنا اعتماد تھا کہ اس جاگیر کے کرتا دھرتا دراصل وہی تھے۔ نواب ممتاز لہ ذولہ نے پہلے تو میرے سادہ لوح باپ کو رند بلانوش بنایا اور پھر رفتہ رفتہ ان کے دماغ کو ایسا بے قابو کیا کہ وہ اس حد تک دماغی توازن کھو بیٹھے کہ نواب ممتاز لہ ذولہ کی اتہام طرازی پر میری ماں کو بھی طلاق دے دی۔ اس کے بعد میرے باپ کی تمام دولت ان کے قبضے میں آگئی اور وہ ان ہی کے قبضے میں رہ کر اور دیوانگی میں جتلارہ کر اس دنیا سے سدھار گئے۔

مسعود

اسلم

عجیب باتیں آپ سنا رہے ہیں۔
میری ماں نے بہت زور لگایا مگر ان کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا کہ وہ اس غاصب کے اس دعوے کو باطل کر سکتیں کہ یہ جاگیر اس نے میرے باپ سے خریدی ہے۔ ظاہر ہے کہ میرے باپ کی دیوانگی سے فائدہ اٹھا کر اس شخص نے اپنی پوزیشن قانونی حیثیت سے مستحکم کر لی ہوگی۔ میری ماں بے چاری بے سہارا تھی۔ وہ نواب ممتاز لہ ذولہ کے ایک معمولی

اسلم : نیر کے ساتھ میں پورے انتقامی جذبے کے ساتھ آیا تھا اور یہ رنگ اس لیے اختیار کیا تھا کہ اس کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔ مگر مجھے یہ خبر نہ تھی کہ میں دراصل تختہ مشق کی حیثیت سے لایا گیا ہوں۔ میرے ساتھ جو سلوک شروع ہوا وہ مجھ کو حیران کرنے کے لیے کافی تھا مگر اس سے پہلے کہ یہ عالم حیرت ختم ہو معلوم نہیں کیو پڑنے کس گوشے سے ایک ایسا تیر چلایا کہ.....

کرئل شیخ : یعنی..... یعنی معاشرۂ شروع ہو گیا۔

مسعود : بات تو سننے دو۔

اسلم : آپ سے زیادہ حیرت خود مجھ کو ہے مگر واقعہ یہی ہے کہ یہ حادثہ ہو کر رہا۔ بظاہر اس کی ذمہ دار خود نیر تھی جس نے مجھ کو اس حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہا جو حیثیت دراصل وہ مجھ کو دینا ہی نہ چاہتی تھی مگر میرے لیے نقل، اصل بن کر رہی۔ وہ دراصل کسی اور کو رقابت کی آنچ میں تپانے کے لیے مجھ سے ایندھن کا کام لینے لگی۔

کرئل شیخ : وہ حضرت آپ کے سامنے موجود ہیں۔

اسلم : جی مجھے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ نیر نے یہ نہایت غلط طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے۔ مسعود صاحب مجھ سے واقف نہیں مگر میں نے مسعود صاحب کے متعلق ہر ممکن معلومات بہم پہنچا رکھی ہے۔

طلعت : مگر اسلم صاحب آپ کو جب سب کچھ معلوم ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ نیر تو آپ کی طرف متوجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر آپ خواہ مخواہ یہ مجاہدہ فرما رہے ہیں۔

اسلم : طلعت بہن آپ نے بڑی معصوم بات کہی ہے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا

و ظیفے پر گزر بسر کرتی رہی مگر جب میں عالم ہوش میں آیا اور اپنی ماں سے یہ باتیں سنیں تو میں نے یہ طے کر لیا کہ جس طرح بھی ہو گا میں اس جاگیر کو ممتاز لڈولہ کے غاصانہ قبضے سے نکلواؤں گا۔ چنانچہ ایک رات میں نے جان پر کھیل کر نواب ممتاز الدولہ کی حویلی میں داخل ہو کر وہ تجوری توڑ ڈالی جس میں اس جاگیر کے کاغذات تھے۔ مگر اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی پکڑا گیا اور نقب زنی کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔ میرے جیل جانے کے بعد میری بد نصیب ماں پھڑک پھڑک کر مر گئی اور جب میں جیل سے چھوٹا تو معلوم ہوا کہ ممتاز لڈولہ بھی منصوبہ حقیقی کے دربار میں پہنچ چکے ہیں۔ اب اس کو میری طلب صادق کہیے یا اتفاق کہ میں اسی گھر میں اس حیثیت سے لایا گیا۔

مسعود : روٹ گئے کھڑے ہو جاتے ہیں آپ کی یہ روداد سن کر۔

کرئل شیخ : یہ تو واقعی عجیب راز معلوم ہوا۔

طلعت : مگر ایک بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس گھر میں پہنچنے کے بعد اب تو آپ آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

اسلم : جی ہاں۔ میں نے اس اتفاق کو اپنی خوش قسمتی سے تعبیر کیا تھا اور اسی لیے یہ ڈھونگ رچا تھا مگر.....

مسعود : صاحب اس گھر ہی میں تو تمام راز ہے۔ مگر کہہ کر اس طرح چپ کیوں ہو گئے آپ۔

اسلم : آپ لوگوں کو جتنی ہمدردی پیدا ہوئی ہے وہ مگر کے بعد والے واقعے سے ہنسی میں اُرجائے گی۔ بس یہی ڈر لگتا ہے مجھے۔

کرئل شیخ : آخر معلوم تو ہو کلمات سے۔

کہ یہ جذبہ جنوں کی صورت اسی وقت اختیار کرتا ہے جب مشکلات اور ناممکنات کے پہاڑ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں۔

کرل شیخ : مگر برادرِ مِ آپ کے حالات سن سن کر تو بخدا بڑی ہمدردی ہوتی تھی آپ کے ساتھ، کہ ایک شخص ناکردہ گناہ خدا جانے کہاں سے آگیا ہے جسے میرا بی بیجنو نامہ حماقتوں کا شکار بنا رہی ہے۔ جسے مار مار کر اپنی ایک طفلانہ ضد کو تسکین دینے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

اسلم : جی ہاں۔ آپ نے غالباً گدھا گاڑیوں میں اُس فاضل گدھے کو تو دیکھا ہوگا جسے بچ کہتے ہیں اور اس کا مقصد زندگی صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ گاڑی کھینچنے والے گدھوں کے لیے نقشِ عبرت بنا رہے۔ اس کو بیٹا جاتا ہے تاکہ دوسرے گدھے اپنے کو اس عذاب سے بچانے کے لیے اپنے کام میں مستعدی دکھائیں۔

کرل شیخ : سن لیجیے مسعود صاحب۔ اسلم صاحب نے اپنے کو تو خیر مع ہی کہا ہے مگر آپ کو بھی اس لپٹ میں لے آئے ہیں۔

اسلم : آپ نے بڑا اچھا پہلو نکال لیا۔ بہر حال تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جس وقت میری مرمت ہو رہی تھی اُس وقت تک تو میں اس کو اپنی کامیاب اداکاری کا صلہ سمجھتا تھا۔ میں نے پہلے تو اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے یہ اداکاری شروع کی تھی مگر بعد میں فن برائے فن کے اصول پر مجھے اس اداکاری ہی میں لطف آنے لگا اور بڑے حوصلے سے چلتا رہا۔ مگر جب اسی عالم میں وہ آگ لگی جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے، تو اداکاری میں وہ نقص پیدا ہو گیا کہ آخر آپ کے ایسے ماہروں نے چوری پکڑ لی۔

مسعود : آپ نے تو معاملے کو کچھ اور بھی الجھا دیا۔ مجھے آپ کے ساتھ پہلے اتنی ہمدردی نہ تھی جتنی اب ہے۔

کرل شیخ : بھی کیا مصیبت خرید بیٹھے ہو تم۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ مس روہی سے عشق کرتے۔

طلعت : اچھا شیخ صاحب، یہ بات ہے آپ بھی پکڑے گئے۔

اسلم : شیخ صاحب آپ تو کچھ نیلامی ماحول پیدا کر رہے ہیں۔

شیخ صاحب : نیلامی ماحول کی بات نہیں ہے حضرت میری تو واقعی یہ رائے ہے کہ مس روپی میں بلا کی جائزیت ہے۔

اسلم : شیخ صاحب آپ مجھ کو غلط نہ سمجھیں۔ میرے پاس چند جذبات اور چند نگاہیں برائے فروخت نہ تھیں کہ میں "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" کے اصول پر چلتا۔ مجھے خود خبر نہیں کہ یہ کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ مگر جو کچھ ہو گیا ہے اب اُس سے مفر نہیں اور مجھے نہیں معلوم کہ میرا انجام کیا ہوتا ہے۔

مسعود : آپ ہماری ہمدردیوں پر پورا بھروسہ رکھیں اور جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے وہ بھی ضرور ہو گا مگر آپ پتھر سے پسینے کی توقع باندھ بیٹھے ہیں۔

شیخ صاحب: عجب کیا ہے کہ آپ کا جذبہ صادق پھر ہی کو موم بنادے۔

طلعت جی ہاں: کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں۔

شیخ صاحب: لیجیے آپ کے لیے گاڑی آچکی۔ طلعت بہن تم اندر چلی جاؤ۔ السلام بھائی میں لقمان کو حکمت تو پڑھانا نہیں چاہتا مگر میرے صرف طلعت کی موجودگی کا ذکر نہ کیجیے گا۔

مسعود : اسلم صاحب اب آپ کو اکثر ملتے رہنا چاہیے۔

اسلم : ضرور ملوں گا اس لیے کہ میری تمام مشکلات کا حل صرف آپ کے پاس ہے۔
مسعود : کاش آپ کا اندازہ صحیح ہو اور میں آپ کے کسی کام آسکوں۔

اس بزم میں اپنے کو یوں بے نقاب کرنے کے بعد اسلم آج بالکل ہی بدلا ہوا یہاں سے رخصت ہوا تا کہ نواب ممتاز لد ولہ کے ایوان میں پہنچ کر وہ پھر ایک اداکار بن جائے۔ وہ اداکار خود اپنی تمثیل کا شکار نظر آتا تھا۔ مگر واپسی سے پہلے ہی کرٹل شیخ اور مسعود نے اس کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ یہاں سے واپسی پر تم سے باقاعدہ جرح ہوگی۔ ایک ایک بات پوچھی جائے گی اور اگر یہ بات چھپائی گئی کہ مسعود بھی اس پارٹی میں تھے تو ظاہر ہے کہ اس کا یقین مشکل ہی سے آئے گا نیز کو۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ مسعود کی موجودگی ظاہر کر دی جائے بلکہ مسعود کا موجود ہونا جب تم بیان کرو گے تو نیز اس کو اپنی کامیابی سمجھ کر بے حد خوش ہوگی۔

مسعود نے کہا۔ ”میری رائے یہ ہے کہ آپ میرا موجود ہونا ظاہر کر کے یہ کہیں کہ میں آپ کی تاب نہ لا کر اس پارٹی سے چلا گیا۔“
کرٹل شیخ نے کہا۔ ”ہاں یہ ٹھیک ہے نیز کو اپنی کامیابی پر ذرا خوش ہو لینے دو۔ اس کو یقین آ جائے گا کہ اس نے جس مقصد کے لیے یہ سارے پاؤں پیلے ہیں وہ مقصد پورا ہو رہا ہے۔“

مسعود نے کہا۔ ”مگر شیخ صاحب قبلہ صرف ان کے بیان سے کام نہ چلے گا۔ اس بیان کی تصدیق کے لیے آپ کو بھی جانا پڑے گا اور نیز پر یہ ظاہر کرنا پڑے گا کہ گویا محض اسلم صاحب کی وجہ سے میرے اور آپ کے تعلقات بھی ختم ہو گئے۔“

اسلم نے کہا۔ ”یہی ہونا چاہیے۔ میں نہایت سادگی سے یہ بیان دوں گا کہ مسعود نامی ایک صاحب ملے تھے جن کو نہ جانے میری کیا بات بُری لگی کہ وہ کرٹل صاحب سے کچھ لڑے اور پھر چلے گئے۔
کرٹل شیخ : ہاں میں دوسرے دن جا کر نیز سے کہوں گا کہ اسلم نے مسعود کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا تھا کہ:

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا

نالہ کرتا تھا ولے طلب تاثیر بھی تھا

مسعود : اس شعر کا کیا تک ہے بھلا۔ یعنی خواہ مخواہ بھی۔

اسلم : جی نہیں یہ ٹھیک ہے۔ میں پہلے ہی سے یہ شعر نیز کو سنار کھوں گا اور کرٹل صاحب کی تصدیق سے وہ خوش ہو جائیں گی۔

اسی قسم کے بہت سے اور فقرے ایک دوسرے سے ملے کر کے اسلم اس پارٹی سے رخصت ہو کر آ گیا۔

مسعود نے طلعت سے وابستگی ظاہر کر کے جس آگ میں اس کو جلایا ہے آج اسلم کو دیکھ کر اسی آگ میں وہ خود جل رہا ہے۔ اس وقت بھی سہ پہر کی چائے پر گھما پھرا کر نیر نے یہی ذکر چھیڑا اور جب کوئی اور نہ ملا تو دفور مسرت میں مس رو بی ہی سے پوچھ بیٹھیں۔



نیر : مس رو بی تم دیکھ رہی ہو اسلم صاحب کتنے بدل گئے ہیں۔
مس رو بی : تو آخر آپ اسلم صاحب کو سمجھتی کیا ہیں بی بی۔ یہ تو اب آپ کی دعا سے اپنی استانی کے بھی کان کاٹنے لگے ہیں۔ آج ایک ایسا سوال مجھ سے کر بیٹھے کہ میں خود حیران رہ گئی۔

نیر : ہاں اب ان کو بڑی دور کی سوچنے لگی ہے۔ کیا سوال تھا اسلم صاحب۔
اسلم : آپ کے کتب خانہ میں دیوان غالب ہے نا اسی کا ایک شعر نہ جانے کیوں یاد رہ گیا تھا۔

سیکھے ہیں مہ زخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

مس رو بی : میں تو ان سے کہا کرتی ہوں کہ جیسے کی باتیں کیا کریں۔

نیر : بھی ایمان داری کی بات یہ ہے کہ میری اور مس رو بی آپ کی محنت دھری رہ جاتی اگر یہ خود اتنے ذہین نہ ہوتے۔ میں تو حیران ہوں کہ انھوں نے مسعود وغیرہ کو ایسے چھپتے ہوئے جواب کیسے دئے۔ ہاں تو اسلم صاحب کیا کہنے لگے مسعود جب آپ نے ہاتھ ملا کر کہا کہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔

اسلم : جی ہاں میں نے تو رسمی طور پر تعارف کے بعد کہا کہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر تو کہنے لگے کہ مجھ سے مل کر آپ کو کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ ابھی

نواب ممتاز لدہ کے ایوان میں اسلم اب تک اداکاری کی ناکام کوششوں میں مصروف تھا مگر یہ ناکام کوششیں بھی نیر کے لیے کافی تھیں۔ نیر نہ تو مسعود کی سی گہری نظر رکھتی تھی، نہ طلعت کی سی ہلاکی ذہانت کہ اس کو بھی اسلم کی ناکام اداکاری کی خامیاں محسوس ہو سکتیں۔ وہ ان ہی خامیوں کو اپنی اور مس رو بی کی کامیابی سمجھ کر خوش تھی کہ اس نے اور اس کی دیوانہ وار جدوجہد نے اتنی جلدی ایک جانور کو انسان بنا کر مسعود کا نہایت کامیاب حریف بنا دیا ہے۔ کرنل شیخ کی پارٹی سے واپس آ کر اسلم نے جو حالات بتائے اور مسعود کے متعلق نیر کے سوالات کے جو بھی جواب دئے ان سے نیر کے جذبہ انتقام کو بڑی تسکین حاصل ہوئی۔ اسلم نے نقشہ ہی ایسا پیش کیا کہ نیر آسانی سے اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ مسعود اس کو دیکھ کر بہت ہی سلگا ہے اور جب اسلم نے نیر کو یہ بتایا کہ معلوم نہیں کس بات پر کرنل شیخ کے ایک مہمان جن کا نام مسعود بتایا جاتا ہے کرنل صاحب کی کسی بات پر ناراض ہو کر پارٹی سے چلے گئے تو نیر کی خوشی کی کوئی انتہا ہی نہ رہی کہ مسعود ہنستے تو ہیں اتنے بے تعلق مگر آخر تاب نہ لا سکے اور ٹھہرا نہ گیا ان سے پارٹی میں۔ اس پارٹی کے بعد مسلسل دو دن تک نیر کے گھر اسی پارٹی کے چرچے رہے۔ وہ بار بار مختلف طریقوں سے اس پارٹی کے حالات اسلم سے دریافت کرتی تھی اور اسلم جو منظر کشی کرتا تھا اس آئینہ میں نیر پھولی نہ سہاتی تھی کہ خود

نیر : ذرا مجھ کو سمجھتے تو دیجیے۔ اول تو یہ کہ مسعود صاحب ان سے خاص طور پر ملنا کیوں چاہتے تھے دوسرے یہ بے چارے ایسی بات کیا کہہ سکتے تھے اُن سے۔ اگر سچ پوچھیے تو ان کو خود کچھ نہیں معلوم مسعود صاحب کے متعلق۔

کرنل : اگر واقعی ان کو کچھ نہیں معلوم تو اور بھی کمال ہے کہ انھوں نے ایسی جیبتی ہوئی بات کہی۔ ہوا یہ کہ میں نے ان کو مسعود سے ملایا کہ آپ ہیں اسلم صاحب اور آپ ہیں مسٹر مسعود۔ ان بے چارے نے کہا کہ آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔

اسلم : جی ہاں، اب آپ خود غور کیجیے کہ کیا اس کا جواب یہی تھا کہ کیوں صاحب آپ کو خوشی کیسے ہو سکتی ہے جب کہ میں آپ کے لیے اجنبی اور قطعاً غیر ہوں۔ اس پر مجھے اتفاق سے غالب کا وہ شعر یاد آ گیا: ”دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا“

کرنل : بس یہی شعر تو قیامت کر گیا۔ مسعود کو یقین ہو گیا کہ میں نے آپ کو مسعود کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے اور جان بوجھ کر اس کو اپنی پارٹی میں بلا کر آپ کے ہاتھوں ذلیل کرانے کی کوشش کی ہے۔

نیر : جی نہیں، یہ دراصل ان کے احساس برتری کا ردِ عمل ہے۔ وہ اپنے متعلق یہ جو سمجھے بیٹھے تھے کہ نہ ان کے برابر کوئی ذہن ہے نہ خوش ذوق ہے، نہ کسی کو بات کرنے کا سلیقہ ہے نہ ان کی فکر کا کوئی ادب شناس ہے۔ اس غرور کا سر جو نیچا ہوا۔ اس پندار کو شکست جو ہوئی۔

کرنل : مگر میرے لیے تو یہ مصیبت آئی کہ وہ چغند مجھ ہی سے ناراض ہو گیا۔ پارٹی میں سمجھایا وہ نہ مانے رنگ میں بھنگ ڈال کر چلے گئے۔ گھر پر گیا

ان کو سمجھانے مگر وہ قسم کھا گئے کہ گویا میں نے دانستہ اسلم صاحب کے ہاتھوں اُن کی تذلیل کرائی ہے۔ صاحب میں تو حیران ہوں کہ وہ آخر جلا کیوں ان کو دیکھ کر۔

اسلم : مگر میں ان سے کم حیران نہیں ہوں کہ آخر یہ بات کیا ہوئی۔ میں نے تو یوں ہی ایک شعر پڑھا دیا تھا مسکرا کر۔

کرنل : بابا اتفاق سے وہ شعر چپک کر رہ گیا۔ بہر حال میں اپنی ہر کوشش میں ناکام رہ کر لوٹ آیا کہ ان کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے۔ میرے خیال میں تو وہ کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہے۔ میں نے اس کو اتنا سٹی، اتنا غیر معقول اور اتنا کج بحث اب سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

نیر : ابھی آپ ان کو اور بھی سٹی اور بھی غیر معقول اور کچھ اور بھی کج بحث پائیں گے۔ اصل قصہ تو یہ ہے شیخ صاحب کو ان کو وہ میرے انتخاب کی حیثیت سے برداشت ہی نہیں کر سکتے۔

اسلم : آپ کے انتخاب کی حیثیت سے؟ میں سمجھا نہیں۔

نیر : میں شیخ صاحب سے بات کر رہی ہوں اسلم۔

اسلم : مگر آپ میرے متعلق بات کر رہی ہیں نا۔ مجھے بھی تو سمجھائیے کہ آپ کا مطلب کیا ہے آخر۔

کرنل : کیا خوب، گویا آپ مطلب ہی نہیں سمجھ رہے ہیں۔ کس قدر سنجیدہ قسم کا مزاح فرماتے ہیں آپ بھی۔

اسلم : شیخ صاحب میں بالکل مزاح سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میں سنجیدگی کے ساتھ آج اس بات کو آپ کی موجودگی میں صاف کر لینا چاہتا ہوں۔

نیر : میں آپ کو سب کچھ سمجھا دوں گی اسلم صاحب، اس وقت مجھے شیخ

کامیاب اداکار ثابت ہوا مگر اب شدت جذبات کے ماتحت اس کی اداکاری میں الہزین پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس وقت اس نے الہزین کی انتہا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کو کرنل شیخ کے سامنے اپنے کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اور اسلم کو علیحدہ لاکر اس نے اسلم کی وہ خبر لی ہے کہ اگر اسلم واقعی اپنے جذبات کے ہاتھوں بے قابو نہ ہو گیا ہوتا تو یہ اس کو دبالتی مگر اب تو اس نے صاف بغاوت کا اعلان کر دیا کہ آخر مجھ کو کیوں تختہ مشق بنا دیا گیا ہے۔ میرے جذبات سے کیوں کھلیا جا رہا ہے۔ مجھ کو یہ یقین دلا کر کہ میں نیر کا مرکز انتخاب ہوں اس بات کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے کہ میں خود اس کا مفہوم ہی نہ سمجھوں۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نیر سے وابستگی میں اتنی دور پہنچ چکا ہوں کہ اب وہاں سے واپسی خود میرے لیے ناممکن ہے اور نیر آج پہلی مرتبہ سراسیمہ تھی کہ اپنی ہی لگائی ہوئی اس آگ سے اپنا دامن کیسے بچائے۔ اسلم نے کمال تو یہ کیا کہ نیر سے یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ تم دراصل مسعود سے محبت کرتی ہو اور مجھ کو صرف مسعود کے لیے ناقابل برداشت بنانے کے لیے ایک کھلونا بنایا گیا ہے۔ مگر یہ صورت خود میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ بمشکل تمام نیر نے اس وقت تو اس کو سمجھا بجا کر اس وعدے کے ساتھ خاموش کیا کہ کرنل شیخ کے جانے کے بعد وہ اس موضوع پر تفصیلی بات کرے گی مگر اس واقعہ نے خود اس کو اتنا الجھا دیا تھا کہ وہ کرنل شیخ کو بھی مطمئن نہ کر سکی اور بجائے اس کے کہ وہ اجازت چاہتے خود تاساڑی طبع کا بہانہ کر کے ان سے معذرت خواہ ہو کر اپنے کمرے میں آگئی تاکہ دماغی توازن درست کرنے کے لیے یک سوئی حاصل کر سکے۔ اسلم نے کرنل شیخ کو جاتا ہوا دیکھ کر ان کو رخصت کرنے کا ارادہ کیا مگر باتیں کرتا ان کے ساتھ مسعود کے گھر تک پہنچ گیا۔

مسعود : آئیے آئیے اسلم صاحب۔ بھی خوب لائے شیخ تم ان کو۔

صاحب سے تنہائی میں کچھ ضروری باتیں کر لینے دیجیے۔ آپ جب تک بیڈمنٹن کا جال لگوائیے۔

روبی : ہاں اسلم صاحب آج میرا آپ کا بیچ رہے گا۔
اسلم : جی نہیں، مجھ کو آج یہ معملہ کر لینے دیجیے جس میں اکثر میں الجھ جایا کرتا ہوں۔

نیر : اسلم کیا ہو گیا ہے۔ بات کیوں نہیں سنتے میری۔
اسلم : سنتا تو ہوں آپ کی بات۔ گستاخی صرف یہ کر رہا ہوں کہ سن کر اب سمجھنا بھی چاہتا ہوں۔ اگر میں آپ کا انتخاب ہوں تو آخر آپ خود مجھ سے کیوں نہیں کہتیں۔ اگر میں آپ کا انتخاب نہیں ہوں تو دوسروں سے یہ کیوں کہتی ہیں۔

نیر : اسلم کیوں خواہ مخواہ کی ضد کر رہے ہو۔ کہہ تو دیا کہ میں سمجھا دوں گی تم کو۔
کرنل : مگر اس میں کیا مضائقہ ہے کہ آپ پہلے ان کو سمجھا دیں پھر مجھ سے بات کریں۔ اسلم صاحب جس معملے کا ذکر کر رہے ہیں اس وقت میں خود اسی میں الجھا ہوا اپنے کو پار ہا ہوں۔

نیر : بہتر ہے، پہلے میں ان ہی سے بات کر لوں۔ معاف کیجیے گا شیخ صاحب میں ذرا ان سے بات کر رہی ہوں۔ تشریف لائیے حضور۔

نیر کو کیا معلوم تھا کہ یہ سب ملی بھگت ہے۔ اسلم نے پارٹی سے واپس آ کر اب تک جو کچھ بتایا ہے وہ سب وہی ہے جو مسعود، طلعت اور کرنل شیخ سے پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ وہ تو اس وقت اسلم کے اس براہ راست سوال پر اور شیخ کے سامنے اس سوال پر سٹپٹا کر رہ گئی۔ بلکہ خود کرنل شیخ بھی حیران رہ گیا کہ اسلم قراداد کے خلاف اس قدر ضد پر کیوں اتر آیا۔ مگر وہ جو مسعود نے کہا تھا کہ اسلم اب تک خواہ کیسا ہی

شیخ : بھئی آج تو ان حضرت نے کمال ہی کر دیا۔ مسعود تم ٹھیک کہتے تھے کہ یہ نہایت اناڑی ایکٹریں ہیں۔

طلعت : (آتے ہوئے) ارے اسلم صاحب؟ اچھا اچھا شیخ صاحب پکڑ لائے ہوں گے۔

مسعود : سنو تو سہمی۔ شیخ تو کوئی نئی داستان لے کر آئے ہیں۔ ہاں تو کیا ہوا؟

شیخ : ان حضرت نے مجھے بھی سٹ پنا دیا۔ یہ آخر سوچھی کیا تھی جناب کو۔ سنا آپ نے تمام اداکاری چھوڑ ایک مرتبہ میرا شیر الٹھ گیا نیر سے کہ آخر تمہارا مطلب کیا ہے اور یہ تم نے ڈھونگ کیا رچا رکھا ہے۔

اسلم : تو آخر کوئی انتہا بھی ہوتی ہے بے وقوف بننے کی۔

طلعت : مگر آپ تو بے وقوف کا کردار ہی پیش کر رہے ہیں۔ اس میں انتہا کیا کیا سوال۔

اسلم : جی نہیں میں جس حد تک بے وقوف بن چکا ہوں اس سے زیادہ کی مجھ میں گنجائش نہیں ہے۔

مسعود : بھائی مجھے سمجھئے تو دو۔ اچھا جب تم نے براہ راست یہ سوال پیدا کر دیا تو نیر کا کیا عالم تھا۔

اسلم : پہلے تو شیخ صاحب کے سامنے وہ بہت جربز ہوئیں۔ پھر مجھے تنہائی میں لا کر دھونس جمانا چاہی مگر میں نے آج صاف صاف کہہ ہی دیا:

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں

عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو

طلعت : آداب بجالاؤ مسعود۔ شعر غالب کا سہی مگر مدوح تم ہی ہو۔

مسعود : اچھا پھر۔ پھر کیا کہا نیر نے۔

صاحب طوطے کی طرح آنکھ پھیر کر حسب معمول غیر متعلق بن گئیں کہ خبردار جو آئندہ یہ خواب دیکھا۔ تمہارے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اور تم کو جو خاک سے پاک کیا گیا ہے یہ معاوضہ ہے صرف اس کا کہ تم کو جو کچھ بنایا گیا ہے بنے رہو مگر اپنی اوقات کو نہ بھولو۔

طلعت : آپ نے کہہ دیا ہوتا کہ:

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب

مسعود : تم کو جو جھڑی ہے شاعری اور میں تفصیلات سننا چاہتا ہوں۔

طلعت : تفصیل ہی کیا ہوتی۔ یہ بے چارے آج تک ضبط کرتے رہے۔ آج بے قابو ہو گئے ہوں گے۔ دل جو بے قابو ٹھہرا۔

اسلم : نہیں طلعت بہن آج مجھ کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ محبت سہی مگر یہ بے حسی کیا معنی۔ میں محبت کو اتنا ذلیل بھی نہیں دیکھ سکتا۔

مسعود : بھائی میرے مشورے تو کر لیا ہوتا۔ بنانا یا کھیل بگاڑنے اور اتنی قربانیوں کو رائیگاں کرنے سے آخر فائدہ کیا ہوا۔

اسلم : جو کچھ بھی مگر نیر کا طرز عمل اب میرے لیے ناقابل برداشت بن چکا ہے۔

مسعود : تو گویا آپ سارا کھیل ختم کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

اسلم : میں اور کوئی راز تو نہیں کھول رہا ہوں۔ میں نے تو اس کو صرف یہ بتایا ہے کہ اس نے خواہ کسی وجہ سے سہی میرے احساس کو بیدار کیا ہے تو میں اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کو کب تک خواب سمجھوں اور کب تک یہ یقین کروں کہ خواب کی تعبیر الٹی ہوگی۔

طلعت : مگر کمال کرتے ہیں آپ۔ زبردستی کسی کو محبت پر کیوں کر آمادہ کر لیں

گے۔ جو زبردستی نیر مسعود کے ساتھ چاہتی ہے وہی زبردستی آپ اس سے کر رہے ہیں۔ یہ تو عجیب ایک طرف فیصلہ ہے۔

اسلم : جی نہیں بلکہ آج میں نے اپنے میں عجیب انقلاب محسوس کیا ہے کہ آئین و فائدہ بھی مل سکتا ہے۔ محبت کو نفرت بننا بھی آتا ہے۔

مسعود : لاجول ولاقوہ۔ آپ صرف محبت کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں آخر اس جاگیر کا کیا ہوگا جس کے لیے آپ نے اتنے پاپڑ نیلے ہیں۔

اسلم : مسعود بھائی مجھے اب اس کی بھی ضرورت نہیں۔ جو شخص محبت کی قربانی دے سکتا ہے وہ جاگیر کو کب خاطر میں لائے گا۔

کرتل : ہاں یاد آ گیا وہ شعر یہ ہے۔
طلعت : شعر؟ شعر کا یہاں کیا ذکر تھا۔

کرتل : یہ کہہ رہے تھے تاکہ آئین و فائدہ مل سکتا ہے۔ میں ایک شعر یاد کر رہا تھا۔
اب یاد آیا کہ:

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے

بہت مجبور ہو کر ہم نے آئین و فائدہ بدلا

مسعود : بھئی خدا کے لیے مجھے کسی ایسی صورت پر غور کر لینے دو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

کرتل : وہ ترکیب تو صرف یہ ہے کہ تم کسی طرح اپنی شادی کر کے اس کو اپنے سے مایوس کر دو جب تک اس کو تمھاری آس ہے وہ یہی حرکتیں کرے گی۔ بات یہ ہے تاکہ ”پیاملن کی آس۔“

اس پیاملن کی آس پر اور تو سب خیر ہنس پڑے مگر مسعود نے جو واقعی اس وقت سنجیدگی سے غور کر رہا تھا سب کی ہنسی پر چونک کر اور خود بھی اس پیاملن کی آس پر غور کرتے ہوئے کہا۔

”جواب نہیں ہے کرتل تمھارے بے ٹکے پن کا اور میں نے اندازہ کیا ہے کہ جتنا ہی معاملہ سنجیدہ ہوتا ہے اتنا ہی جناب کا یہ بے ٹکا پن شباب پر آتا ہے۔“

کرتل : حضرت میں مذاق نہیں کر رہا ہوں اور نہ یہ میرا بے ٹکا پن ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ نیر اس وقت تک بلکہ اسی وقت تک یہ تیزی اور یہ اکڑنوں دکھا رہی ہے جب تک اس کو اس بات کا یقین ہے کہ تم سوائے اس کے اور کسی کے نہیں ہو سکتے۔

مسعود : کیا باتیں کر رہے ہو۔ اگر یہ غلط فہمی تھی بھی تو اب کیسے ہو سکتی ہے۔
اسلم : نہیں صاحب یہ غلط ہے۔ مجھے کرتل صاحب سے سولہ آنے اتفاق ہے

کہ اس کو یہ غلط فہمی اب تک گھیرے ہوئے ہے اور یہ واقعہ ہے کہ یہی غلط فہمی اس کی اصل طاقت ہے۔ اگر آج اس کو یقین ہو جائے کہ وہ آپ کو واقعی حاصل نہ کر سکے گی تو اس کی یہ کیفیت باقی نہ رہے۔ یہی پسندار تو اس کی اصل بیماری ہے کہ آپ کے دل میں اس کا چور موجود ہے اور آپ اپنے کو دانستہ دھوکہ دے رہے ہیں۔

طلعت : میری بھی یہی رائے ہے۔
اسلم : خیر آپ تو اس معاملے میں چپ ہی رہیں تو اچھا ہے اس لیے کہ اس قسم کے موقعوں پر لڑکی ذات کو نہ بولنا چاہیے۔

کرتل : ٹھیک فرماتی ہیں نانی جان آپ۔
اور تو سب ہنس کر چپ ہو گئے مگر طلعت واقعی خالص مشرقی انداز سے



وہ جو ایک محاورہ ہے الٹی آنتیں گلے پڑیں۔ وہی حال نیر کا تھا۔ اسم کے متعلق اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا یہ سعادت مند اور ہونہار شاگرد فارغ التحصیل ہو کر اپنے کو مکتبِ غم عشق کا طالب علم ثابت کرے گا۔ وہ اپنے نزدیک اس کو ایک ایسا جانور سمجھ کر سدھا رہی تھی جو اس کے اشاروں پر چلے گا اور اپنی عقل سے کبھی کام نہ لے سکے گا مگر اسلم تو اس کے لیے مصیبت بن گیا۔ کرنل شیخ کے سامنے اپنی اس جلی نے اس سے میاؤں کہا تھا اور اب وہ میراں تھی کہ آخر ہوگا کیا۔ اسلم تو اس کی جان کا گاہک بن چکا ہے۔ وہ چلی تو نماز بخشنا نے وہاں روزے بھی گلے پڑے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلم سے اب وہ ڈرنے لگی تھی اور اپنے میں اتنی جرأت نہ پاتی تھی کہ اسلم سے کوئی فیصلہ کن بات کر سکے۔ مسعود والا قصہ تو گیا جہنم میں اب تو اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح اسلم سے نجات حاصل کرے اور عالم یہ تھا کہ وہ اسلم سے جان بچاتی پھرتی تھی اور اسلم گویا یہ طے کر چکا تھا کہ وہ نیر سے اپنی قسمت کا فیصلہ کرا کر رہے گا۔ وہ اس کو طرح طرح سے گھیرنا چاہتا تھا اور نیر ہر مرتبہ صاف نکل جاتی تھی۔ کاش وہ اندازہ کر سکتا کہ نیر کی حالت آج کل کس حد تک قابلِ رحم تھی۔ وہ نہ کسی سے ملتی تھی نہ گھر میں کسی چہل پہل کی روادار تھی۔ اس عالم میں اگر اس کا کوئی غم گسار تھا تو صرف میرا جس سے اپنے مرحوم مالک کی اس لاڈلی کا یہ حال دیکھنا جاتا

جھینپ کروہاں سے چلی گئی اور اس کے اس طرح جھینپنے پر اور بھی تہقہہ پڑا۔ جب یہ ہنسی تھی تو مسعود نے کہا۔

مسعود : میں بھی اب اس نتیجہ پر پہنچ رہا ہوں کہ واقعی جب تک نیر کو اس طرف سے مایوس نہ کیا جائے گا اس کی اصلاح ناممکن ہے۔

کرنل : بلکہ جب تک وہ جناب کی طرف سے مایوس نہ ہوگی ہمارے اسلم میاں کی دال نہ گ سکے گی۔ اس لیے کہ فی الحال تو وہ کچھ اور سوچنے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔

مسعود نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بہت اچھا میں اس کی ترکیب بھی نکالتا ہوں مگر اس کے لیے مجھے طلعت سے مشورے کی ضرورت ہے جس کو آپ سب نے یہاں سے بھگا دیا ہے۔“ یہ کہہ کر مسعود بھی اندر چلا گیا اور یہاں یہ محفل برہم ہو گئی۔

تھا۔ معلوم نہیں اس نے نیر سے کوئی بات کی تھی یا خود ہی اس کو یہ سوچھی کہ اسلم کے کمرے میں آکر اسلم کو سمجھانے کی کوشش شروع کر دی غالباً۔ مس روپی یہی خدمت پہلے سے انجام دے رہی تھیں۔

بیرا : صاحب ایک بات کہوں۔ اگر آپ برائے مانیں۔

اسلم : بڑے تکلف سے بات کر رہے ہو آج تو۔ قصہ کیا ہے آخر۔

بیرا : میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ جس ڈال پر کوئی بیٹھے اسے کاٹنا نہیں چاہیے۔ میں تو اسی کا قائل ہوں کہ جس ہانڈی میں کھائے اُس میں چمید نہ کرے۔

اسلم : میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔

بیرا : بی بی کا آج کل جو حال ہے وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا اور میں جانتا ہوں یہ سب کچھ آپ ہی کی وجہ سے ہے۔

اسلم : اور میرا یہ حال تم سے دیکھا جا رہا ہے جو تمہاری بی بی کی وجہ سے ہے۔

روپی : خطا معاف، آپ کی حالت تو اُس بچے کی سی ہے جو چاند کے لیے ضد کرے۔

اسلم : مس روپی، میں جانتا ہوں آپ اتنی نا سمجھ نہیں ہیں جتنی بھولی بن رہی

ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ ضد اس چاند نے خود پیدا کرائی ہے اور بیرا

تم یہاں کی ایک ایک بات سے واقف ہو۔ تم کو معلوم ہے کہ مجھے یہاں

اس لیے لایا گیا تھا کہ مجھے جانور سے آدمی بنا کر تمہاری بی بی اس قائل

بنادیں کہ مجھ سے مسعود کو جلا سکیں۔ مگر یہ بات مجھے اُس وقت معلوم

ہو سکی جب میں اس بات کا یقین کر چکا تھا کہ تمہاری بی بی مجھ کو اپنے

قائل بنارہی ہیں۔

بیرا : میں جانتا ہوں۔ یہ ان کی غلطی تھی۔ ان کی سب سے پہلی غلطی یہ تھی کہ وہ

مسعود میاں کو غلط سمجھیں۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ جب مسعود میاں کو وہ سمجھ گئی تو ان کے ایسے بہرا آدمی کو اپنا مخالف سمجھ بیٹھیں اور ان کو اپنے گھر سے چلا جانے دیا۔ تیسری غلطی یہ تھی کہ مسعود میاں کو جلانے کے لیے وہ آپ کو پکڑ لائیں۔

اسلم : اور آخری غلطی یہ تھی کہ مجھ کو اپنا منگیتر ظاہر کر کے میرے دل میں یہ خیال پختہ کر دیا کہ وہ میری بن رہی ہیں اور مجھے اپنا بتا رہی ہیں۔

روپی : جی ہاں۔ مگر ان سب غلطیوں سے بڑی غلطی اب آپ کر رہے ہیں کہ

ان کے دل میں اپنے لیے جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اسلم میاں، میری یہ

بات گرہ میں باندھ لیجیے کہ بی بی آپ کی کبھی نہیں ہو سکتیں۔ آپ خواہ مخواہ اپنے کو اور ان کو پریشان کر رہے ہیں۔

اسلم : مگر یہ بات آپ مجھ کو اس وقت بتا رہی ہیں جب میں اپنے کو خواہ مخواہ

سہمی مگر نیر کا بنا چکا ہوں۔ نیر نے میرے دل میں اپنے واسطے جو جگہ

بنائی ہے وہ بغیر اس کے ایک سنان سا ویرانہ ہے جس میں صرف اسی کا

تصور گونج رہا ہے۔

روپی : نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں اسلم میاں۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ پہلے تو

نیر بی بی خواہ مخواہ مسعود صاحب کو اپنا سمجھتی رہیں پھر خواہ مخواہ آپ کو ظاہر

کرتی پھر ہیں۔

اسلم : معاف کیجیے مس روپی، میں بیرا سے ایک خاص بات پوچھ لوں۔ بیرا تم

اضغر میاں کو جانتے ہو جو خان بہادر صاحب مشہور تھے۔ تمہارے نواب

کے بڑے دوست تھے۔

بیرا : ان کو آپ کیسے جانتے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ان کا جاننے والا ایک

میں ہی ہوں۔ بڑی خدمت کی ہے میں نے ان کی بھی۔

اسلم : مجھے یقین ہے کہ تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان ہی خان بہادر صاحب کی دوستی نے ممتاز لدلہ کو اتنا بڑا آدمی بنادیا۔

بیرا : مجھے سب معلوم ہے مگر اب ان باتوں سے کیا حاصل۔ پیسے کے لیے دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔

اسلم : ہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ اس حد تک ہوتا ہے کہ اس تمام دولت کا اصل وارث اس وقت تمہارے سامنے اس طرح موجود ہے کہ.....

بیرا : آپ..... اکبر میاں..... مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہ صورت دیکھی بھالی ہے۔ بچپن میں بہت دیکھا۔ جوانی میں صرف ایک مرتبہ دیکھا جب نواب صاحب کی زندگی میں آپ تجوری سے کاغذ نکالنے آئے تھے اور چوری کے الزام میں پکڑے گئے تھے۔ مگر.....

اسلم : مگر کچھ نہیں بیرا۔ میں جیل سے رہا ہو کر اسی لیے یہاں آیا تھا کہ نہ صرف اپنی جائداد حاصل کروں گا بلکہ غاصبوں سے انتقام بھی لوں گا..... مگر یہاں گل ہی دوسرا کھل گیا۔ میر نے اپنے خاندانی دشمن کو اپنا گرویدہ بنالیا اور.....

بیرا : اکبر میاں غضب کر دیا آپ نے بھی۔ یہ بات آپ مجھ کو اب بتا رہے ہیں جب اپنی اتنی گت بنوا چکے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ خان بہادر صاحب اللہ بخشے اسی گھر میں کیسی کیسی تکلیفیں اٹھا کر مرے ہیں اور ایک میں تھا جس نے ان کی اس وقت خدمت کی ہے جب وہ بے چارے اپنے حواس ہی میں نہ تھے۔ اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ آپ اکبر میاں ہیں تو کیوں یہ نوبت آتی۔

اسلم

بیرا

اسلم

بیرا

اسلم

بیرا

اسلم

بیرا

اسلم

بیرا

اسلم

بیرا

اسلم

بیرا

نیر

اسلم

نیر

اسلم

نیر

بہر حال اب بھی سویرا ہے۔

آپ کے کاغذ میں دوں گا آپ کو۔ میں گواہ موجود ہوں کہ یہ دولت آپ کی ہے۔ میں گواہی دوں گا کہ آپ کے باپ کے ساتھ نواب صاحب نے کیا سلوک کیا ہے۔ ان کو کس طرح پاگل بنایا گیا اور کیوں کر ان کی دولت ہتھیائی گئی۔

یہاں تو قصہ ہی کچھ اور چھڑ گیا۔

بیرا میں یہ کچھ نہیں چاہتا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس دولت کی جو مالک ہے وہی میری مالک بن جائے۔

پھر وہی لڑکپن کی باتیں۔ اکبر میاں۔ سانپ کا بچہ سنپولیا ہی ہوتا ہے۔ آپ سنپو لیے سے امرت کی امید نہ رکھیں۔ اس کا تحفہ تو زہری ہوتا ہے۔ دوسرے میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ وہ مسعود میاں کی دیوانی ہے۔ اللہ بچائے بے چارے مسعود میاں کو۔ فرشتہ ہے وہ آدمی فرشتہ۔ اگر میری مانوا کبر میاں تو مسعود میاں کو اپنا راز دار بتالو۔

وہ میرے راز دار ہیں اور میں انھیں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ مگر وہ بھی کیا کر سکتے ہیں۔

چپ رہیے، وہ آ رہی ہیں۔

(قریب آتے ہوئے) صاحب میں آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔

زہے نصیب۔

آپ کرنل شیخ سے آخری مرتبہ کب ملے تھے؟

کرنل شیخ سے۔ غالباً پرسوں..... کیوں بات کیا ہے؟

کوئی خاص بات کی تھی ان سے آپ نے۔ میرا مطلب ہے مسعود کے

متعلق۔

اسلم : میرے اور ان کے درمیان عام طور پر خاص ہی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ کا کس قسم کی بات سے مطلب ہے؟

نیر : آپ فوراً ان لوگوں کے پاس جائیے اور مجھے آکر اطلاع دیجیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج مسعود اور طلعت کا نکاح ہے۔

بیرا : بیاہ ہے مسعود میاں کا۔

اسلم : میں ابھی جاتا ہوں۔ مگر حیرت ہے کہ مجھے مدعو نہیں کیا اور نہ مجھ سے کوئی خاص ذکر آیا۔

نیر کی اطلاع غلط نہ تھی۔ اسلم کو مسعود کے گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ واقعی آج نہایت سادگی کے ساتھ طلعت کا نکاح مسعود سے ہو رہا ہے اور اس اچانک تقریب کی وجہ یہ ہے کہ طلعت کی والدہ کا پروگرام حج بیت اللہ کا بن چکا ہے۔ اسلم کو دیکھتے ہی مسعود نے بڑی حیرت سے کہا۔

مسعود : کرنل شیخ کہاں ہیں؟

اسلم : سہراگند حواریہ ہوں گے کہیں۔

مسعود : ابھی وہ تم کو بلانے گئے ہوئے ہیں صبح سے، میں تو سمجھا تھا کہ نیر نے ان کو بھی گرفتار کر لیا، تو کیا وہ تم سے بالکل نہیں ملے۔

اسلم : شیخ صاحب سے تو ملاقات ہوئی نہیں۔ البتہ یہ خبر مجھ کو نیر ہی نے سنائی ہے۔

مسعود : بہر حال میں آج حسب وعدہ آپ کے راستے سے ہٹ رہا ہوں۔

طلعت کی والدہ کا اصرار تھا کہ آج ہی دو چار آدمیوں کے سامنے دو بول

پڑھ دئے جائیں۔ ابھی چند گھنٹے ہوئے یہ پروگرام بنا ہے لہذا سب سے پہلے تم کو بلوانے کی کوشش کی گئی اور شیخ صاحب سے بھی ہم ہاتھ دھو بیٹھے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ حضرت گئے کہاں آخر؟

طلعت : (آتے ہوئے) ارے آپ... آپ آگئے۔ شیخ صاحب کہاں گئے۔

مسعود : ان کو تو نیر نے خبر دی ہے... شیخ صاحب لاپتہ ہیں۔

اسلم : مگر میں کہتا ہوں کہ دلہن بی آج تو ذرا شرم کر لیجیے۔ منہ پر ٹھیکرے برسے لگیں گے۔ بھلا غضب خدا کا، یہ دلہن پھر رہی ہے منہ جھار سر پہاڑ۔

مسعود : یہ کیا خالہ اماؤں کی سی باتیں شروع کر دیں۔ لیجیے تشریف لارہے ہیں۔

اسلم : آداب بجالاتا ہوں حضور!

شیخ صاحب : (بہس کر) تم تو پیشگی ہی آگئے۔ یار میں پھنس گیا تھا جو بری کی دوکان پر۔ تھک دینے کے لیے ایک نکلس پسند کیا تو اس میں نگ ہی نہ تھے۔ اپنے سامنے بیٹھ کر لگوائے ہیں۔

مسعود : اور منع جو کیا تھا تم کو کہ یہ تکلف کا موقع نہیں ہے۔

شیخ صاحب : جناب کے مشورے کا شکر یہ مگر یہ تکلف نہیں بلکہ فرض تھا۔ دیکھو ابھی طلعت ہے کیسا۔ ایک سو ایک نکلسوں میں سے یہ چنا ہے۔

طلعت : کیا کہنا ہے آپ کے انتخاب کا، مگر خدانہ کرے کہ کوئی آپ کے سپرد کوئی انتظام کرے۔

شیخ صاحب : بابا وہ سب کچھ ہو گیا ہے۔ اگر اپنی شادی کے انتظامات میں آپ دخل نہ دیں تو کوئی مضائقہ ہے؟

اسلم : یہی میں بھی کہہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر تو دلہن بن لو۔

شیخ صاحب : یار تیرا میدان آج صاف ہو رہا ہے۔

آگے قسمت ہے تری اور ہمت مردانہ ہے

اسلم : حضور والا آج تو نیر بیگم بڑی سراسیمہ نظر آ رہی تھیں۔ مجھے خاص طور پر بھیجا ہے کہ میں اس خبر کی تصدیق کروں۔

شیخ : بھی مسعود تم کو چاہیے کہ نیر کو خود بھی اطلاع کرو۔

مسعود : میں خود سوچ رہا تھا مگر کہیں وہ اس کو چھینڑ چھار نہ سمجھیں۔ ان کے دماغ کا کیا ٹھکانہ؟

طلعت : وہ سمجھیں تو سمجھا کریں۔ مگر آپ کو چاہیے کہ آپ اپنی بہن کی حیثیت سے ان کو شرکت پر آمادہ کریں۔ بہر حال منانا تو پڑے ہی گا۔

اسلم : اب اس جھگڑے میں آپ لوگ نہ پڑیں تو اچھا ہے۔

مسعود : خیر میں اس جھگڑے میں پڑنے سے ڈرتا نہیں ہوں مگر نیر کہیں یہاں کی محفل کا رنگ پھیکا نہ کر دے۔

شیخ : رنگ تو وہ پھیکا اس وقت کریں گی جب اُن کا آنے کا بھی ارادہ ہو۔ مجھے تو یقین نہیں کہ وہ آئیں۔

طلعت : مسعود میری رائے میں وہ آئیں یا نہ آئیں تم تو اپنا فرض پورا کرو۔

اور سب کی آخر میں یہی رائے ہو گئی کہ اتنے دنوں کے بعد مسعود خود نیر کے پاس جائے اور اس کو اپنی بہن کی حیثیت سے نکاح میں شرکت کی دعوت دے۔ یہ کام آسان نہ تھا مگر مسعود نے ہمت کی اور وہ کرنل شیخ اور اسلم کے ساتھ نیر کے یہاں جا پہنچا۔ جس وقت نیر کو مسعود کے آنے کی خبر ہوئی ہے وہ اس خلاف توقع واقعہ پر کچھ گھبراہٹ مئی مگر پھر بہت ہی لیے دئے انداز سے گول کمرے میں آگئی جہاں سب اس

کے منتظر تھے۔

نیر : آداب عرض کرتی ہوں شیخ صاحب۔ یہ کہاں راستہ بھول پڑے آپ۔

مسعود : راستہ تو میں بھول پڑا ہوں یا زیادہ صحیح یہ ہے راستہ میں نے یاد کیا ہے۔

نیر : شکر یہ آپ کا۔ عزت افزائی فرمائی آپ نے۔

شیخ : ابھی بقول شخصے، وقت ہے تمہارا کام بہت ہے، لہذا بغیر کسی تمہید کے یہ

عرض کرنا ہے کہ مسعود آج آپ کو یہ یاد دلانے آئے ہیں کہ آپ ان کی

بہن ہیں اور یہ بہ حیثیت بہن کے آپ کو اپنے نکاح میں شرکت کی

دعوت دے رہے ہیں۔

مسعود : یہ دعوت میں خود دوں گا۔ میں اپنی نکچڑی ہوئی بہن کو منانے آیا ہوں۔

نیر : اس پر شکر کا شکر یہ۔ اور بھی کچھ کہنا ہے؟

مسعود : ہاں۔ اور یہ کہنا ہے کہ میں تم کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔

نیر : نوازش آپ کی۔

اور سب نے دیکھا کہ اس کے پچھلے چہرے پر جہاں اب تک ہوائیاں اُڑ

رہی تھیں ہلکی سی سرفی نمودار ہوئی۔ دونوں ہونٹ کانپنے اور آنکھوں میں نمی سی پیدا

ہوئی۔ اس کے بعد وہ ایک چھلاوے کی طرح کمرے سے غائب ہو گئی۔ پہلے تو سب

دم بخود بیٹھے رہے۔ اس کے بعد مسعود اٹھا اور وہ بھی کمرے کے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر

سنانا چھایا رہا، پھر برابر کے کمرے سے نیر کی بچکیوں اور سکیوں کی آوازیں آتی رہیں

اور ساتھ ہی ساتھ مسعود کی آواز بھی جو کچھ لمبے لمبے فقرے کہتا ہوا سنا دیتا تھا۔ گول

کمرے میں اس وقت شیخ صاحب کے بے معنی قہقہے بھی گنگ تھے اور اسلم بھی بت بنا

بیٹھا تھا۔ آخر مسعود کی آواز گونجی جو بیرے کو بلا رہا تھا۔ اس وقت نیر کی بچکیاں اور

سکیاں بند ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد مسعود نیر کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے

کمرے میں آیا۔

مسعود : لو بھی دیکھ لو میری ہنگی بہن کو، رو رو کر آنکھیں سجالی ہیں۔ مگر اب میری بہن میری شادی میں شرکت کرے گی۔

شیخ : یعنی آج نکاح میں نہیں۔

مسعود : نہایت مہمل ہیں آپ، میں اسی کو شادی کہہ رہا ہوں۔ میری مسرت کا اندازہ کرو کہ مجھ کو اپنی کھوئی ہوئی بہن بھی مل گئی۔

شیخ : یا رتم یقیناً جادو گر ہو۔ بہر حال خدا مبارک کرے۔ اسلم صاحب مبارک باد دیجئے نا۔

نیر : اسلم صاحب۔ نہیں اکبر صاحب۔

اسلم : (چونک کر) کیا فرمایا آپ نے۔

نیر : اب زیادہ بننے کی کوشش نہ کیجیے۔ جس کھیل میں آپ اپنی کامیاب اداکاری کے جوہر دکھا رہے تھے وہ ختم ہو چکا۔ مجھ کو بہت کچھ مس روہی اور میرے سے معلوم ہو چکا تھا۔ جو باقی تھا وہ میں نے مسعود..... یعنی مسعود بھائی جان سے سن لیا۔

کرئل شیخ : مسعود بھائی جان؟ اب مجھے یقین آیا کہ واقعی مسعود کو پھڑی ہوئی بہن مل گئی۔

بیرا : (کمرے میں آتے ہوئے) اللہ جانتا ہے چھوٹے میاں آج جامن کے پیڑ پر صبح ہی صبح کوؤں کی برات آئی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔

کرئل شیخ : تم ٹھیک کہتے ہو۔ آج ایک اشرف المخلوقات کوے کی برات ہے۔

نیر : اچھا بیرا تم جلدی کرو..... مس روہی سے کہو کہ میرے کپڑے نکالیں، مجھ

کو شادی میں جاتا ہے۔

بیرا : نہیں بی بی، اب برات اسی گھر سے جائے اور دلہن اسی گھر میں آئے۔

اسلم : بات تو معقول ہے۔ میری بھی یہی رائے ہے۔

اور یہ رائے ایسی تھی کہ سب ہی نے اس سے اتفاق کیا اور اسی گھر میں برات کے انتظامات شروع ہو گئے۔



آج نواب ممتاز ولد کی کونھی میں عجیب چہل پہل نظر آرہی تھی۔ کئی موٹر بھی موجود تھے اور ایک موٹر کو پھولوں سے آراستہ کرنے میں بیرا اپنی تمام کارگیری صرف کر دینا چاہتا تھا۔ کرنل شیخ کے قبضے میں ایک گاڑی تھی جو کبھی فرمائے بھرتی ہوئی آتی تھی اور کبھی پھر فرمائے بھرتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ آخر مغرب سے کچھ پہلے مسعود کو کرنل شیخ، اسلم، جلال اور رفیق گھیرے ہوئے باہر لائے۔ اسلم نے زبردستی اس کے گلے میں ایک گونے کا بار ڈال دیا ورنہ وہ سلیٹی رنگ کے نہایت خوش وضع سوٹ میں اپنی چھب تو ضرور دکھارہا تھا مگر دلہا ہرگز نہ معلوم ہوتا تھا۔ ابھی اسلم نے گونے کا بار ڈالا ہی تھا کہ نیر جو واقعی مدھنوں والے لباس میں تھی دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے پھولوں کا ایک مونا سا گجر مسعود کی گردن میں ڈالنا چاہا تو مسعود ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور ہاتھ سے نیر کو روک کر کہا ”بھئی یہ کیا واہیات ہے۔ خواہ بخواہ چنجد بنانے سے آخر کیا فائدہ۔“

نیر : دیکھ رہے ہیں آپ کرنل صاحب، ان کے ساتھ رعایت جو کی گئی ہے تو دماغ ہی خراب ہو گیا۔ شکر ادا نہیں کرتے کہ سہرے سے ان کو بخش دیا ہے۔

کرنل شیخ : حالانکہ میں اس رعایت سے خوش نہیں ہوں۔ شادی کرنے چلے ہیں اور

سہرے سے ڈرتے ہیں۔ وہی مثل کہ گڑ کھائیں اور گھٹکوں سے پرہیز۔ پہنا دو یہ بارز بردستی۔

مسعود : (گردن جھکا کر) بہتر ہے صاحب میں اپنی بہن سے یوں ہی ڈرتا ہوں کہیں پھر نہ رُوٹھ جائے۔

کرنل شیخ : اور میں نے کہا مس روٹی کہاں غائب ہیں۔

نیر : خیریت تو ہے کرنل صاحب، یہ مس روٹی کی طرف جو خاص توجہ جناب فرما رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے گا اس کو ہم لوگ۔ جناب کا محض اخلاق سمجھ کر چپ ہو رہے ہیں گے۔ آخر یہ قصہ کیا ہے۔

رفیق : آپ اگر یہ سوال نہ کرتیں تو ہم میں سے کسی اور کو یہی بات پوچھنا پڑتی۔ واقعی کرنل صاحب مزاج تو اچھے ہیں۔

کرنل : یعنی خواہ مخواہ بھی۔ میں نے تو ایک بات پوچھی کہ وہ نظر نہیں آتیں۔

اسلم : حضور والا یہ بات یوں ہی تو جناب نے ہرگز نہیں پوچھی ہے۔ میں تو کئی مرتبہ اندازہ کر چکا ہوں کہ کچھ خاص ہی توجہ ہے۔

مسعود : خیر اب تو یہ قصے شروع ہی ہو چکے ہیں۔ انشاء اللہ ان کے سہرے کے پھول بھی کھل ہی جائیں گے۔

کرنل : بے ہودے ہیں آپ۔ ذرا سی بات پوچھ کر گناہ گار ہو گیا۔

نیر : مس روٹی کو پہلے ہی طلعت بھابی کے پاس روانہ کر دیا ہے تاکہ وہ وہاں کے انتظامات کی دیکھ بھال کریں۔ بہر حال یہ بات میں مس روٹی سے کہوں گی ضرور کہ کرنل صاحب کی طبیعت تمھارے لیے کچھ تاسا ہے۔

کرنل : نیر بخدا الزانی بوجائے گی اگر تم نے یہ شرارت کی۔ بہر حال اب روانگی میں دیر نہ کرو وہاں انتظار ہو رہا ہوگا۔

باقاعدہ دولہا بنا خاموش بیٹھا ہے۔

مسعود : مس رو بی آپ کو اس گھر میں چونکہ پورا اختیار ہے لہذا اب کھانا کھلوایے تاکہ روانگی جلد ہو سکے۔

مس رو بی : ایسی بھی کیا بے صبری مسعود صاحب۔ لیکن تو اب اس بی گنی ہے۔ یہ اچھی محبت ہے کہ بھوک دل سے زیادہ ستا رہی ہے۔

رفیق : ان کو تو لیکن مل گئی ہم تو صرف پیٹ کی روٹی چاہتے ہیں۔

مس رو بی : بس ابھی لیجیے۔ غالباً میز چن دی گئی ہوگی۔ میں دیکھتی ہوں جا کر۔

مس رو بی کے جانے کے بعد سب نے کرمل شیخ کی طرف بیک وقت دیکھا جو حد نظر تک مس رو بی کا نگاہوں سے تعاقب کرنے میں مصروف تھے۔ اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو ایک دم سب کو اپنی طرف دیکھتا ہوا دیکھ کر کچھ شرمندہ سے جو ہوئے تو سب نے قہقہہ بلند کر کے اور بھی ان کو شرمندہ کر دیا اور وہ اپنی خفت منانے کے لیے خود بھی کھیانی ہنسی ہنسی کر بولے۔ ”بھئی تم لوگ مجھ کو واقعی نکو بنا دو گے۔“

اسلم : مجھے ایک شعر کسی کا یاد آ گیا ہے پہلے وہ سن لو ورنہ بھول جاؤں گا:

ہمارے واسطے اب موت بن کے چلی ہے

وہی نگاہ جو اُن کو گنی تھی پہچانے

کرمل شیخ : حالانکہ میں بخدا یہ دیکھ رہا تھا کہ اس لڑکی کو نیر نے غرارہ پہنا کر اس کا خلیہ ہی بدل دیا۔

مسعود : داد دیتا ہوں پہلے تو لفظ لڑکی استعمال کرنے کی

طلعت : (بات کاٹ کر) میں بھی اس لفظ لڑکی پر چوکی تھی۔

مسعود کو پھولوں سے آراستہ کار میں نیر خود لے کر بیٹھ گئی اور باقی دوست دوسری گاڑیوں میں روانہ ہوئے۔ جس وقت یہ سادہ برات طلعت کے گھر پہنچی ہے سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اتنی ہی دیر میں مس رو بی نے اس گھر کو بھی نہایت نفاست اور سلیقے کے ساتھ آراستہ کر دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ دولہا کو پھولوں کی چادروں سے آراستہ ایک بارگاہ میں بٹھایا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں قاضی صاحب نے مسعود اور طلعت کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا۔ نکاح ہو جانے کے بعد جب قاضی صاحب واپس تشریف لے گئے تو مس رو بی اور نیر طلعت کو بھی باہر لے آئیں۔ طلعت اس وقت عنابی رنگ کی چمچاتی ہوئی ساری میں واقعی لیکنوں کی طرح سینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر اسلم نے کہا ”یعنی واقعی آپ تو غالباً شرمانے کی کوشش کر رہی ہیں۔“

نیر : غالباً نہیں یقیناً یہی کوشش ہے مگر اس پر جناب کو کچھ اعتراض ہے۔

کرمل : اعتراض تو خیر کیا ہوتا البتہ حیرت ضرور ہو رہی ہے کہ شرمانے کی کس قدر کامیاب ایکٹنگ کی جا رہی ہے۔

مس رو بی : جی نہیں، یہ ایکٹنگ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مشرقی عورت کی بے ساختگی ہے۔

کرمل : اچھا یعنی آپ بھی جانتی ہیں مشرقی عورت کی بے ساختگی کو۔

مس رو بی : جی ہاں، اس لیے کہ عورت تو میں بھی ہوں اور نصف مشرقی بھی ہوں۔

کرمل : مان گئے صاحب۔ قائل کر دیا آپ نے۔

اسلم : وہ تو ہوتا ہی تھا آپ کو قائل۔ مس رو بی ہی آپ کو قائل کر سکتی ہیں۔

کرمل : تم مانو گے نہیں اسلم۔ خبردار جواب بولے۔ مسعود کو دیکھو کس قدر

مسعود : اچھانی الحال بس کرو۔ وہ آ رہی ہیں مس روہی۔

مس روہی نے قریب آ کر خالص میزبانوں کے انداز سے سب کو کھانے کی میز پر چلنے کی دعوت دی اور سب مس روہی کے ساتھ کھانے کی میز پر آ گئے۔ کھانے کی میز ہی کون سی کسی دعوت کی میز تھی چند تو کھانے والے تھے مگر مس روہی نے اس میز کو سجانے میں مشرقی اور مغربی نفاست پسندی کا گلدستہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ تمام میز پر پھولوں کی خوبصورت بلیں بچھا کر ان پر عجیب عجیب نقش و نگار بنائے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ خوبصورت اور شان دار کیک دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جو مس روہی نے خاص اپنے اہتمام میں بنوایا تھا۔ مس روہی سب سے پہلے طلعت اور مسعود کو اس کیک کی طرف لے گئیں اور ان سے کہا ”یہ رسم مجھ کو معلوم ہے کہ آپ کے یہاں نہیں ہے مگر میری خاطر سے یہ کیک آپ دونوں مل کر کاٹیں تاکہ مجھے بھی معلوم ہو سکے کہ میں بھی اس تقریب میں شریک تھی اور مجھ کو بھی دولہا اور دلہن پر کوئی حق حاصل تھا۔“

مسعود : یقیناً حق حاصل ہے۔ آپ کے یہاں کی یہ رسم تو ہے بھی بڑی جذباتی رسم۔ لو بھی طلعت مس روہی کی یہ خواہش پوری کرو۔

طلعت نے آگے بڑھ کر مسعود کے ساتھ کیک کاٹ دیا اور سب نے اس رسم کی ادائیگی پر تالیاں بجا کر مس روہی کے جذبات کا پورا احترام کیا۔ کیک کے ٹکڑے کھانے سے پہلے سب ہی کو تقسیم کئے گئے اور مس روہی کا اصرار تھا کہ جب تک یہ کیک سب چکھ نہ لیں گے اس وقت تک کسی کو کھانا نہ ملے گا۔ یہ لوگ ابھی کیک ہی چکھ رہے تھے کہ بیرا گھبرا ہوا آیا اور اس نے اس انداز سے کہا جیسے خدا نخواستہ آگ لگ گئی ہو۔

”چھوٹے صاحب غضب ہو گیا۔ وہ وہ آ گئے ہیں۔ زیدی صاحب۔ زیدی

کرئل شیخ : لیجئے صاحب چھٹی ہوئی، وہ جو شرم کی عارضی کوشش کی گئی تھی ختم ہو گئی۔

نیر : اب آپ کے شرما جانے کے بعد اس بے چاری کو اس کی ضرورت ہی کیا رہی۔

جلال : صاحب میں آخر کب تک چپ رہوں۔ میرے دوست پر مسلسل اور متواتر حملے ہو رہے ہیں۔ ساری خدائی ایک طرف اور میرا بھائی ایک طرف۔

رفیق : ٹھہرے مولانا۔ پہلے ہم آپ کی حیثیت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ مشہور ضرب المثل کے مطابق آپ کی حیثیت کچھ بہت ہی نازک ہوئی جاتی ہے۔

اسلم : جی ہاں پہلے یہ بات طے ہو جانا چاہیے۔ ضرب المثل تو یہ ہے کہ ساری خدائی ایک طرف جو روکا بھائی ایک طرف۔

جلال : خیر میں جو روہی سے تو رہا۔ زبان کی ذرا سی لغزش سے اتنا بڑا انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔ مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ آخر کرئل شیخ کا قصور کیا ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ آخر یہ بے چارے بھی انسان ہیں۔ ان کے سینے میں بھی دل اور دل میں گداز کا امکان ہے۔ یہ بھی دنیا میں فی الحال تنہا ہیں اور ان کو بھی زندگی کے طویل سفر کے لیے آخر ایک شریک سفر کی ضرورت ہے۔

کرئل : لا حول ولا قوۃ۔ اب بات ختم بھی کر چکو۔ یا تو بات کرتے ہی نہیں اور بولے ہیں تو یک مشت بولتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

جلال : خیر آپ کے اس طرح ڈانٹنے سے میں سچی بات کہنے اور آپ کی طرف داری کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

صاحب۔

نیر نے چونک کر کہا۔ ”کون زیدی؟ وہ ڈبل بور زیدی تو نہیں۔“

مسعود : ہاں ہاں وہی ہوں گے۔ مگر اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔
آگیا ہے تو آجانے دو۔

اور قبل اس کے کہ زیدی کو بلایا جائے وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے بولے ”اٹھا یعنی یہاں سب ہی موجود ہیں۔ نیر صلابہ میں آداب عرض کرتا ہوں۔ کہیے مزاج تو اچھے ہیں۔“

نیر : جی ہاں۔ اب تک تو اچھے تھے مزاج اب خدا ہی حافظ ہے۔

مسعود : بہر حال زیدی باقی سب سے ملائے دیتا ہوں۔ یہ ہیں میرے دوست
کرل شیخ۔ یہ ہیں مسٹر رفیق۔ ان سے ملو یہ ہیں جلال صاحب۔ یہ ہیں
مس روپی۔ اور یہ ہیں طلعت جو ابھی آدھا گھنٹہ ہوا تمھاری بھابی بنی
ہیں۔

زیدی : آدھا گھنٹہ ہوا بھابی بنی ہیں۔ اچھا تو گویا یہ..... یہ..... مگر مجھے سمجھاؤ تو
سبکی بات کیا ہے۔ ممکن ہے میں غلط سمجھ جاؤں۔

نیر : پہلے آپ نے خود سمجھنے کی کوشش کی تھی اور اچھا ہی ہوا کہ خود نہیں سمجھے
ورنہ خدا جانے کیا سمجھ بیٹھتے۔

زیدی : جی ہاں یہی اندیشہ پیدا ہوا تھا مجھے۔

اسلم : جناب والا، ان لوگوں نے مجھے آپ سے نہیں ملایا ہے، کہیں میرے
متعلق آپ نے کچھ سمجھ بیٹھیں۔ میرا نام اسلم ہے اور بخدا اس قصے اور اس
رشتے سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔

مسعود : بھی ان کا نام ہے طلعت اور اب یہ مسز مسعود ہیں۔

زیدی : (ایک دم بھونچکا ہو کر) اچھا۔ یعنی گویا تم مسعود، یہ مسز مسعود بھابی
آداب عرض کرتا ہوں۔

اس گھبراہٹ پر قہقہوں کا وہ طوفان برپا ہوا کہ تو پہلی اور اسی طوفان میں مس
روپی نے سب کو کھانے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تاکہ کھانا خراب نہ ہو اور
ایک پلیٹ زیدی کے ہاتھ میں بھی تھادی۔ مگر زیدی اب تک حیران تھا کہ مسعود کی یہ
شادی ہو کیسے گئی اور یہ اتفاق کیسے واقع ہو گیا کہ عین شادی ہی کے دن وہ یہاں پہنچ
بھی گیا۔ مگر اس وقت اس کا دماغ کچھ تو سفر کی وجہ سے ماؤف تھا ہی دوسرے اسے
اندیشہ تھا کہ کہیں اس کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ لہذا وہ چپ ہی ہو رہا۔ مگر نہ جانے اس
کو کیا یاد آیا کہ ایک دم پلیٹ میز پر رکھ کر باہر بھاگنے کی کوشش ہی کی تھی کہ بیرانے اس
کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ ”گھبراہٹ نہیں صاحب سامان اتار لیا ہے، تاکے والے
کو رخصت کر دیا ہے۔ آپ کھائیں۔“

زیدی نے لوٹ کر پلیٹ اٹھاتے ہوئے کھانا نکالا اور نیر کے قریب آ کر کھانا
کھاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس لیے پریشان ہو گیا تھا کہ سامان کا تو خیر کوئی مضائقہ
نہیں مگر سوٹ کیس میں وہ تمام بلنیاں ہیں جو مال میں بک کرا کے چلا ہوں۔“
نیر نے فریاد کے انداز سے کہا۔ ”مسعود بچاؤ مجھے۔ یہ آگئے ہیں کاروباری
گفتگو کرنے۔“

زیدی : جی نہیں مجھے معلوم ہے کہ آپ کو کاروباری باتوں سے الجھن ہوتی ہے۔
میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ تاکے والا سامان لے کر بھاگ جاتا
تو سب سے زیادہ نقصان ہوتا یہ کہ بلنیاں چھڑانے میں لوہے لگ
جاتے۔

اسلم : تو گویا جناب کچھ کاروبار کرتے ہیں۔

نیر : خدا کے لیے اسلم صاحب، رحم فرمائیے ہم سب بے گناہوں پر۔

اسلم : ہاں تو زیدی صاحب کیا ہے کاروبار جناب کا۔

زیدی : جی میں کپڑے کی تجارت کرتا ہوں۔ کاروبار کراچی میں ہے مگر اب

لاہور میں بھی اپنی شاخ قائم کر رہا ہوں۔ خیر یہ دوکانیں وغیرہ تو یوں ہی

ہیں اصل کام میرا پورٹ اکسپورٹ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ آج

کل لاہور کا کپڑے کا بازار کیسا جا رہا ہے۔

اسلم : میں نے پچھلے سال ایک قیص کا کپڑا خریدا تھا اُس وقت تو بازار اچھا

خاصہ جا رہا تھا۔

زیدی : جی کیا مطلب آپ کا؟

نیر : جی ہاں اب ملے ہیں آپ کو آپ کی بات کا جواب دینے والے۔ اب

آپ آپس میں ایک دوسرے کا دماغ تناول فرمائیں۔ اب مجھے کوئی

اعتراض نہیں۔

اسلم، زیدی اور نیر تو ایک طرف الجھے رہے۔ ادھر کھانا ختم ہونے کے بعد

مس روہی نے واپسی کے انتظامات مکمل کر لیے اور مسعود نے بیرے کو سمجھا دیا کہ

زیدی کا سامان بھی کوٹھی ہی جائے گا۔ چنانچہ کھانے کے بعد مسعود تو طلعت کی والدہ

کے پاس اندر چلا گیا اور ادھر مس روہی نے تمام سامان جو طلعت کے ساتھ جانے والا

تھا۔ موٹروں پر لدا کر کچھ تو روانہ کر دیا اور کچھ اس وقت ساتھ گیا جب مسعود طلعت کو

لے کر باہر آئے اور سب کے ساتھ کوٹھی روانہ ہو گئے۔



نواب ممتاز لدہ ولہ کی وہ کوٹھی جو نواب صاحب کے انتقال کے بعد دوسری

مرتبہ اس دن ویران ہوئی تھی جب مسعود اس کوٹھی سے گیا، آج ایسی بھری پُری نظر آتی

تھی کہ جیسے اس گھر کے دن واقعی پلٹ گئے ہوں۔ مسعود اور طلعت کے آجانے سے

ہر وقت ایک تازہ چہل پہل نظر آتی تھی اور سب تو خیر، نیر خود اس قدر خوش نظر آتی تھی

کہ ہر ایک کو اس بات پر حیرت تھی کہ آخر مسعود نے کون سا جادو کر دیا ہے کہ وہ مدت

کے بعد انتہائی کشیدگی کے عالم میں نیر سے ملنے آیا۔ نیر کو اپنی شادی کی اطلاع دے کر

اس پر جچ پوچھی تو پہاڑ تو زانگر تھوڑی ہی دیر میں اس کو ایسا رام کیا کہ اب وہ نہ صرف

اپنی زندگی بھر کی آرزوؤں کے مزار کی ایک خاموش سگواری تھی بلکہ وہ تو اس طرح خوش

تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کبھی طلعت کے لیے اپنی مرضی کے کپڑے نکال رہی ہے کہ

مس روہی آج بھابی کو یہ جواز پہنا کر ان کے بال اس وضع کے بنا دو۔ کبھی طلعت کو کسی

سے ملانے کے لیے پارٹی کے انتظامات میں اپنے کو گم کئے ہوئے ہے۔ کبھی طلعت کو

مسعود کے ساتھ سنیما بھیجنے کا انتظام کر رہی ہے۔ کبھی طلعت کے لیے خود پھولوں کے

گہنے بنانے میں مصروف ہے۔ مختصر یہ کہ واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ارمان بھری

ساس اپنی بہو کے لیے یا کوئی محبت چھڑکنے والی نند اپنی سچ کج کی بھانج کے لیے

اپنے ارمان پورے کر رہی ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ طلعت کو ہر وقت دلہن کی طرح سجاے

بنائے رکھے۔ جب دیکھے اسی کے چونچلے ہو رہے ہیں۔ اس کے انقلابی رنگ کو دیکھ دیکھ کر سوائے مسعود کے اور سب حیران تھے کہ آخر یہ ہوا کیا۔ ایک میرا جو نیر کو بچپن سے جانتا تھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس انقلاب کو دیکھ رہا تھا۔ مس رولی جو نیر کی خاص راز دار رہ چکی تھیں چکر میں تھیں کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ اور تو اور اسلم کے تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ آخر ایک دن اسلم نے نیر کو طلعت کے لیے بارگوندھتے ہوئے باغ کے ایک گوشے میں تنہا پا کر یہ ذکر چھیڑ ہی دیا۔

”بھئی مجھے ایک بات سمجھا دو نیر کہ اُس جادوگر مسعود نے تم پر آخر کیا افسوس پھونکا ہے کہ کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ ہم لوگ تو حیران تھے کہ مسعود کی شادی کے سانچہ کو تم برداشت کیوں کر کرو گی مگر اب دیکھ یہ رہے ہیں کہ جیسے یہ شادی ہی تمہارا زندگی بھر کا ارمان تھی۔“

نیر : اکبر صاحب.....

اسلم : ٹھہریے صاحب، میں اس نام پر احتجاج کرتا ہوں۔ میرا نام اکبر نہیں اسلم ہے۔ اس لیے کہ اکبر میرا وہ نام تھا جو میرے ماں باپ نے اس وقت رکھا جب خود مجھے کوئی ہوش نہ تھا۔ اسلم میرا وہ نام تھا جو تم نے رکھا اور اس وقت رکھا جب اس نام کو قبول کرنے کا مجھ میں شعور موجود تھا۔ مجھ کو یہ نام اس قدر عزیز ہے کہ جب کوئی مجھے اس نام سے پکارتا ہے تو خود اپنے اوپر پیارا آجاتا ہے۔

نیر : بہتر ہے اکبر صاحب نہ سہی اسلم صاحب سہی۔ بہر حال تھی یہ کہہ رہی تھی اسلم صاحب کہ مجھے مسعود سے جو وابستگی تھی یا جو وابستگی ہے وہ اس قدر گہری اور خالص ہے کہ اس پر کسی لیبل کے لگنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف مسعود کی محبت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جب مجھ کو اس وہم نے

گھیرا کہ میں یہ محبت حاصل نہ کر سکوں گی تو میرا رنگ دوسرا تھا جس کا مجھ سے زیادہ آپ کو علم ہے اور جب مجھ کو مسعود نے یہ سمجھا کر قائل کر دیا کہ میں اس محبت کو غلط راستے سے حاصل کرنا چاہتی تھی اور صحیح راستہ یہ ہے تو اب میرا یہ رنگ ہے جو دیکھ سب رہے ہیں مگر سمجھ صرف میں ہی سکتی ہوں یا مسعود سمجھ سکتے ہیں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مسعود کو مجھ سے کس قدر محبت ہے میں مسعود کی اسی محبت کی طرف سے مشکوک ہو گئی تھی اور اب مجھ کو یقین ہو چکا ہے کہ مسعود کو مجھ سے وہی بے پناہ محبت ہے جس کی مجھ کو تلاش تھی۔

یا تو میں پاگل ہوں کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے.....

(بات کاٹ کر) ورنہ میں احمق ہوں کہ ایسی بات کہہ رہی ہوں۔ جی نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں قصہ یہ ہے کہ آپ کی طرح میں بھی اس حماقت میں مبتلا تھی کہ محبت کی تکمیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ شادی ہو جائے۔ حالانکہ محبت کی ایک تو تکمیل ہی نہیں ہوتی۔ دوسرے شادی تو محبت کی موت ہے، تیسری اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ بات خود مسعود نے مجھ پر روشن کی کہ مجھ کو مسعود سے جو محبت ہے وہ اُس محبت سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ ہے جو محبت کرنے والوں کو میاں بیوی بنا کر رکھ دیتی ہے۔ جب مجھ کو یہ محسوس ہوا کہ مسعود کے سینے میں میری محبت سے لبریز ایک دل دھڑک رہا ہے اور اس محبت کا نام بہن کی محبت ہے تو مسعود کی آنکھوں میں اپنے لیے بھائی کی کشش میں نے پہلی مرتبہ محسوس کی اور مجھ کو خود بخود اندازہ ہو گیا کہ زندگی بھر میں نے اپنے کو جس فریب میں مبتلا رکھا وہ خود میری ہی غلطی تھی۔

اسلم

نیر

اسلم : مگر میں ایک عجیب انقلاب یہ دیکھ رہا ہوں کہ مسعود اپنی شادی کے بعد سے جس قدر خاموش ہو گیا ہے اور گرم سم سار ہتا ہے اتنی ہی تم ٹکافتہ نظر آتی ہو، چپکلی چپھاتی پھرتی ہو۔

نیر : جی ہاں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اب میں مسعود کے لیے ایک معہ بن کر رہ گئی ہوں۔ وہ مجھ کو سمجھا چکے اور میں ان کو بخوبی سمجھ چکی مگر وہ آپ سب کی اس حیرت سے بے خبر نہیں ہیں۔ خیر اس کو بھی ایک وقتی بات سمجھ لیجئے تو بھی مسعود کو اب یہ فکر ہے کہ وہ میری زندگی کو کسی طرح مسرتوں سے لبریز کر دیں۔ ان کو احساس ہے کہ وہ اپنی زندگی تو بہار آفریں بنا چکے ہیں مگر میری زندگی ان کے نزدیک ہر وقت خزاں کی زد میں ہے۔ ان کو ڈر ہے کہ کہیں میری دنیا ہمیشہ کے لیے ویران نہ ہو جائے۔ وہ نہ جانے کیوں اپنے کو کچھ خود غرض سا محسوس کرنے لگے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں اسلم صاحب کہ مسعود کن نازک احساسات کے آدی ہیں۔ کاش ان کو اندازہ ہوتا کہ میں ان کو خوش دیکھ کر کس قدر خوش ہوں۔

اسلم : میرے خیال میں یہ اندازہ ان کو ہے اور اسی اندازے کے بعد وہ اور بھی اپنے کو مجرم سمجھتے ہیں۔

نیر : جی نہیں، مجرم نہ کہیے۔ وہ مجرم نہ ہیں نہ اپنے کو سمجھتے ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کو یہ احساس ستا رہا ہے کہ گویا انھوں نے خود غرضی سے کام لے کر اپنی زندگی تو سنوار لی اور مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو ان کو میری طرف سے یہ یقین ہو جائے کہ میری زندگی میں بھی مسرت اور شادمانیاں موجود ہیں۔

اسلم : اس بات کا یقین دلاؤ تو گویا اب تمہارا فرض ہو انیر۔

نیر : مگر میں خوش تو ہوں۔ آخر میری اس خوشی پر ان کو شک کیوں ہے۔ وہ اس خوشی کو میری خوشی کیوں نہیں سمجھتے۔

اسلم : وہ اتنے نا سمجھ نہیں ہیں کہ مسرت کے اوپری خول کو اصل مسرت سمجھ کر مطمئن ہو جائیں۔ اگر تم مجھ کو معاف کرو نیر تو میں اس سلسلے میں کچھ صاف باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مسعود کو اصل فکر یہ ہے کہ تمہارے لیے تمہاری زندگی کے ساتھی کا مسندس طرح طے کیا جائے۔

نیر : جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ مگر مسعود اس کو نیا ام کے قسم کی چیز سمجھتے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تو بہ ہے ان کو بھی اسی وقت نازل ہونا تھا۔

”کس قدر اہم اور خوش قسم کی بنیدہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نہ جانے زیدی کو یہ کیسے خبر ہوئی کہ باغ کے اس گوشے میں نیر موجود ہے۔ وہ حضرت بال بال موتی پروئے نہایت قیمتی سوٹ پہنے اور اس پر نہایت شوخ رنگ کی ٹائی باندھے جس سے ان کی بد مذاقی بلکہ بد تمیزی ظاہر تھی، تشریف لے آئے اور آتے ہی ایسا بے ہودہ تہقید لگایا ہے کہ نیر کو وہ پھول بھی غصے سے پھینک دینا پڑے جو اس نے بڑے چاؤ سے پہنے تھے۔ زیدی نے قریب آ کر کہا ”اچھا تو گویا آپ دونوں یہاں چھپے بیٹھے ہیں اور میں ہر طرف ڈھونڈ رہا ہوں آپ کو۔ نیر صلابہ کیارائے ہے آپ کی اس کپڑے کے متعلق اور کیسا سلا ہے یہ سوٹ۔“

نیر : ”ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب۔“

اسلم : خیر یہ تو غلط ہے۔ بات اصل میں یہ ہے زیدی صاحب کہ آپ آدی ہیں نہایت خطرناک حد تک جامہ زیب۔ میں نہ کپڑے کی تعریف کر سکتا

ہوں نہ سلائی کی۔ میں تو آپ کی چھب کی داد دیتا ہوں۔ کیا جسم پایا ہے کہ جو پھن لیا قیامت برپا کر دی۔

زیدی : مگر یہ کپڑا بھی نہایت قیمتی ہے۔ اتنا نرم اونٹنی کپڑا اور یہ وضع آپ کو ہزار دو ہزار کپڑوں میں بھی مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ یہ اصل میں صرف ایک ایک سوٹ کے ٹکڑے آتے ہیں اور ایک ٹکڑے کی وضع کا دوسرا ٹکڑا نہیں ہوتا۔

نیر : کس قدر گھناؤنی باتیں شروع ہو گئیں۔

اسلم : بھلا زیدی بھائی کل کتنا سرمایہ صرف ہوا ہوگا اس سوٹ پر؟

نیر : خدا کے لیے اسلم صاحب..... سرمایہ صرف ہوا ہو یا خزانہ، مگر بحث ختم کرادیجیے۔

زیدی : مگر اسلم صاحب نے سرمایہ کچھ غلط بھی نہیں کہا ہے۔ یہ نہایت قیمتی کپڑا ہے اور اس کو سلوا یا بھی ہے میں نے خالص انگریز درزی سے۔ آپ کو معلوم ہے اسلم صاحب اس کی سلائی میں نے کیا دی ہے۔

اسلم : لیجیے بھلا ہمیں کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ نہ ہم نے کبھی ایسا قیمتی لباس پہنا اور نہ کسی انگریز درزی سے کبھی حجامت کرائی۔

زیدی : آپ کو معلوم ہے بندہ نواز کہ میں نے واقعی انگریز حجام سے حجامت بھی کرائی ہے۔ بھئی ایک بات تو ہے اسلم صاحب کہ یہ انگریز دام تو خیر کس کر لیتے ہیں مگر واہ واہ حق ادا کر دیتے ہیں۔ اب دیکھئے اس سوٹ کو کہ جیسے سانچے میں ڈھالا ہو۔

اسلم : مگر بھائی صاحب سانچہ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا آپ کا ہے..... اور یہ آپ سر پکڑے کیوں بیٹھی ہو۔

نیر : میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ زیدی صاحب کو لے کر یہاں سے چلے جائیں، کہیں ورنہ مجھ کو اجازت دے دیں۔ مجھے کوئی دل چسپی نہیں ہے اس کپڑے سے یا اس کی قیمت سے یا اس کی قطع و برید سے یا اس کی سلائی سے۔

اسلم : وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ کپڑے کا کیا دیکھنا۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ اس کو پہننے والا کون ہے اور کیسا ہے۔

نیر : اسلم صاحب آخر آپ کیوں مجھ کو مجبور کر رہے ہیں کہ میں اس سلسلے میں کوئی سخت بات کہہ دوں۔ زیدی صاحب آپ کو آپ کا سوٹ مبارک ہو مگر ہم نے آخر کیا گناہ کیا ہے۔

زیدی : جی نہیں۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ کپڑے کا انتخاب بجائے خود ایک فن ہے اور اگر میں کپڑے کا بیوپار نہ کرتا ہوتا تو شاید یہ سلیقہ خود مجھ میں نہ ہوتا۔

نیر : صاحب ہمارا دماغ بزازہ نہیں ہے کہ آپ گزروں کے حساب سے بد مذاقی فروخت کریں ہمارے ہاتھ۔

زیدی : میں سمجھا نہیں کہ آپ کو کیا بات ناگوار ہوئی۔

اسلم : زیدی صاحب اصل میں ان کے سر میں درد ہے اور طبیعت کچھ چرچری ہو رہی ہے۔ آئیے ہم دونوں طلعت بھابی کی طرف چلیں۔

اور اسلم نے واقعی نیر کو جان سے بے زار دیکھ کر یہی مناسب سمجھا کہ زیدی کو یہاں سے ٹال لے جائے، حالانکہ سر کے درد کا حال سن کر وہ دوسری کچھ دوائیں بھی تجویز کرنے والے تھے۔ اسلم اور زیدی کے جانے کے بعد بھی نیر دیر تک دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی رہی اور اس وقت چونکی جب اسلم واقعی زیدی کو طلعت پر

نازل کر کے واپس آیا اور اس نے کہا۔ ”جواب نہیں ہے ان حضرت کا بھی۔ بمشکل تمام طلعت بھائی سے ان کو الجھا کر آیا ہوں۔“

نیر : کتنی اہم اور سنجیدہ باتیں ہم دونوں میں ہو رہی تھیں کہ وہ آٹپکے۔

اسلم : تو گویا آپ بھی ان کو اہم اور سنجیدہ باتیں سمجھتی ہیں۔ بہر حال آپ یہ کہہ رہی تھیں کہ اس مسئلہ کو مسعود نیلام کے قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ میں نہیں سمجھا۔

نیر : یہی تو میں سمجھا رہی تھی۔ دیکھئے اسلم صاحب یہ نیلام نہیں تو اور کیا ہے کہ غلط یا صحیح طریقے پر میں بچپن سے وابستہ رہی مسعود سے، پھر لیکا ایک مجھ کو بتایا، سمجھایا اور یقین دلا کر مطمئن کیا گیا کہ میں مسعود کی محبت کو غلط زاوئے سے دیکھ رہی تھی اور میں نے گویا ایک غلط فہمی کو پروان چڑھایا تھا۔ پھر مسعود کی نظر انتخاب میرے لیے اس جانور پر پڑی جس کا نام زیدی ہے اور اب مسعود کچھ اور سوچ رہے ہیں۔

اسلم : مجھ کو اسی سے دل چسپی ہے جو مسعود اب سوچ رہے ہیں۔ مسعود جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ آپ کو بھی معلوم ہے اور مجھ کو بھی۔

نیر : مگر آپ خود ہی بتائیے کہ یہ نیلام نہیں تو اور کیا ہے۔

اسلم : فرض کر لیجئے کہ یہ نیلام ہی ہے تو کیا آپ کو اس سے اختلاف ہے۔

نیر : اسلم صاحب میں نے اس مسئلہ پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

اسلم : مگر یہ تو بہر حال طے ہے کہ زندگی کے لیے ایک ساتھی کا آپ کو انتخاب کرنا ہے۔

نیر : مجھ کو جب مسعود میں بھائی کی محبت مل گئی تو میری وہ حسرتیں بے آسرا ہو گئیں جو مسعود کے لیے تھیں، اور یقین جانے کہ پھر میں نے اس مسئلہ

پر کبھی غور نہیں کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ انتخاب مجھ کو کرنا چاہیے مگر میں اپنی قوت فیصلہ سے مایوس ہو چکی ہوں۔

اسلم : اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب خواہ کوئی بھی ہو، آپ کے نزدیک کوئی زیادہ فرق پیدا نہیں ہوتا اگر یہ سچ ہے تو زیدی۔

نیر : (چونک کر) لند زیدی کا نام میرے سامنے نہ لیجئے۔ قوت فیصلہ اب ایسی بھی منطوق نہیں ہوئی کہ زیدی میں مجھ کو خوبیاں نظر آنے لگیں اور میں زیدی کو اپنے لیے گوارا بنا سکوں۔

اسلم : اب میں براہ راست یہ سوال کرتا ہوں کہ مسعود کی طرف سے آپ کے سامنے یہ تجویز آئے کہ اسلم جس کو تم نے اپنے شایان شان بنانے کے لیے نہ جانے کتنی محنت کی ہے، اس کے متعلق اب کیا رائے ہے۔

نیر : میں یہ تجویز سن کر پُپ ہو جاؤں گی۔ اس لیے کہ میری قوت فیصلہ جواب دے جائے گی۔

اسی وقت باغ کے اس گوشے کی جھازیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور مسعود طلعت کے ساتھ ہنستا ہوا سامنے آ گیا۔ نیر اس طرح شیشائی جیسے اسے کسی نے صین چوری کے وقت گرفتار کر لیا ہو۔ مسعود کے چہرے پر غماز مسکراہٹ تھی اور طلعت کا چہرہ خوشی سے تھمرا ہوا تھا۔ اسلم کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا کہ یہ کیسے نمودار ہو گئے مگر بہت ہی جلد مسعود نے سمجھا دیا۔ ”میں صرف یہی سننا چاہتا تھا اپنی بہن سے کہ وہ پُپ ہو جائے گی اور جب اس کی قوت فیصلہ جواب دے جائے گی تو اس کا وہ بھائی فیصلہ کرے گا جو اس کی زندگی پھولوں سے لبریز کر دینا چاہتا ہے۔“

طلعت : تو ہے، کتنے دنوں کے بعد مسعود کے پہرے پر آج تبسم کی کچھ لہریں پیدا ہوئی ہیں۔

سودیشی سے بدیشی

یا تو شدت پسند ہونا ہندوستانیوں کی فطرت میں داخل ہے یا مرزا کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ لاکھ سمجھاتے رہے، خوشامدیں کیں، بقول پنجابی احباب کے لکچر پلائے کہ دیکھوں میاں اور چاہے جو کچھ کرو مگر خدا کے لیے پڑھنا لکھنا نہ چھوڑو۔ اگر اس سال فیل بھی ہو گئے تو آئندہ سال پاس ہو جاؤ گے۔ پڑھ لکھ کر چاہے لیڈر بننا، چاہے جیل جانا تم کو اختیار ہے، لیکن اب تو جاہلوں کا ٹھکانا جیل میں بھی نہیں ہے، تمہارے ایسے محدود استعداد کے افراد ملک کو بجائے آزاد کرانے کے اور بھی مشکلات میں مبتلا کرنے کے باعث ہو سکتے ہیں۔ تم بغیر لکھے پڑھے چاہے کھدر پہن کر اپنے کو قومی لیڈر سمجھنے لگو، چاہے اسکول چھوڑ کر براہ راست جیل خانہ چلے جاؤ لیکن رہو گے جاہل اور ایک والنیر سے زیادہ کوئی حیثیت تم کو حاصل نہ ہوگی۔ لیکن ہمارا یہ سمجھنا بجھنا بالکل ایسا ہی ہوتا تھا گویا بھینس کے آگے بین بجایا جا رہا ہے۔ مرزا سب کچھ سنتے تھے لیکن سمجھتے صرف یہ تھے کہ گویا ہم بے وقوف ہیں اور اپنی طرح ان کو بھی بے وقوف بنانا چاہتے ہیں، اول تو وہ ہماری کسی بات کا جواب ہی نہ دیتے تھے اور اگر دیا بھی تو صرف یہ کہ تم کیا جانتو تمہارے دماغ میں تو غلامی اس طرح ٹھوس دی گئی ہے کہ ”تم آزادی کا خیال بھی نہیں لا سکتے۔ ہندوستان ہمارا ہے اور ہم اس کے ہیں ہم اس کو آزاد کرائیں گے اور آزاد نہیں گے۔“ ہم نے لاکھ لاکھ کہا

طلعت : اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ آج میں کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ مگر اسلم صاحب، یہ واضح رہے کہ میری نیر واقعی نیلام پر نہیں چڑھائی جا رہی ہے بلکہ اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ خود اس کے ہاتھ بک جانے کی کوشش کریں۔
اسلم : گویا بردہ فروشی کو آپ پھر رواج دینا چاہتے ہیں۔ مگر کیا مضائقہ ہے اس میں۔ ہزار بار بھی یوسف بکے غلام نہیں۔

طلعت : ذرا آئینہ دیکھ لیں یوسف صاحب۔
مسعود : بہر حال مولانا میں نے تو فیصلہ سنا ہی دیا ہے۔ آگے آپ کی صلاحیت کہ اپنے کو کن داموں بیچتے ہیں۔
اور اسی وقت مس روٹی بھری ہوئی شیرینی کی طرح غصے سے سُرخ اور اشتعال سے کانپتی ہوئی وہاں پہنچیں۔

”مسعود صاحب اگر آپ کو اپنے دوست مسٹرزیدی بہت عزیز ہیں تو ان سے کہیے کہ شرافت کے ساتھ اس گھر میں رہیں۔ ان کو کیا حق تھا کہ میرے کمرے میں آکر مجھ کو سوتے سے جگایا اور پھر مجھ کو اپنا نیا سوٹ دکھا کر پوچھا کہ میں کیسا معلوم ہوتا ہوں۔ یہ آخر بدتمیزی کی کون سی قسم ہے۔“

اسلم : قسم اول۔ مگر اب آپ اطمینان رکھئے کہ وہ آئندہ اپنی جامہ زیبی کی داد کسی سے نہ لیں گے۔ یہ سوانگ جس کھیل کے لیے وہ رنج رہے تھے وہ کھیل ہی ان کے لیے ختم ہو گیا۔ میں ان کو ایک ایسی اطلاع دینے جا رہا ہوں کہ اپنے سوٹ پر ان کو اپنے ارمان کے کفن کا شبہ ہو۔

اسلم واقعی چلا گیا اور مسعود نے بڑی شفقانہ محبت سے نیر کو دیکھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگایا اور طلعت نے نیر کے دو آنسو اپنے رومال پر لے لیے۔

کر دیتے اس لیے کہ ان کے استعمال کی ہر چیز صرف سودیشی ہی نہیں بلکہ کھدر کی ہوتا چاہیے تھی۔ لحاف، توشک، چاندنی اور تکیہ وغیرہ تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن عینک کے شیشے صاف کرنے کے کپڑے سے لے کر جوتا پونچھے کے کپڑے تک اور جائے نماز سے لے کر میز پوش تک سب کھدر ہی کھدر نظر آتا تھا حالانکہ ان حضرات سے لاکھ کہا کہ ”جناب ابھی کھدر کی اتنی کثرت نہیں ہے کہ آپ اس کو اس فیاضی کے ساتھ استعمال کریں۔ اگر ہر ہندوستانی ایک ایک کھدر کا رومال رکھنا چاہے تو شاید ہندوستان میں کھدر کا کافی ثابت ہوگا۔ آپ جو اس بے شکے پن سے کھدر استعمال کر رہے ہیں اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ گویا تمام ہندوستان میں آپ ہی ایک قوم پرست ہیں اور باقی چاہے جو کچھ پہنیں، اور لوگوں کے واسطے بھی باقی رہنے دیجئے گا یا نہیں؟“ لیکن انھوں نے ہمارے اس کہنے کو اس طرح ٹال دیا جس طرح بڑے بوڑھے نادان بچوں کی بات پر مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ لہذا ہم نے اور ہماری طرح دوسرے کہنے والوں نے بھی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اس لیے کہ ان کے نزدیک سمجھدار اور ذی ہوش انسان وہی تھا جو دوسرے سے پیر تک ”سودیشی سمجھدار“ بنا ہوا ہو اور دوسرے کو بھی اسی حالت میں دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔ لہذا اس حیثیت سے ہم لوگ تو ایک سرے سے بے وقوف ہی تھے، ہماری بات وہ مانتے تو کیا مانتے۔

یہ تغیر ملاحظہ فرمائیے کہ جس دن سے ”شریمان مرزا جی“ نے کھدر میں اپنے کو لپیٹا گویا ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ گھر والوں سے غیر مطمئن، احباب سے ناخوش، حد یہ ہے کہ اس ہونے والی سسرال سے بھی متنفر ہو گئے جس کے سنگ آستان پر جمین نیاز جھکاتا نہیں بلکہ گھستا ان کے نزدیک جزو ایمان تھا اور اس تمام تغیر کا سبب وہی سودیشی اور بدیشی مسئلہ تھا۔ گھر والے ان کی کھدر پوشی پر خوش نہیں ہوتے تھے۔ لہذا ان سے ناخوش ہونا ایک اصولی بات تھی۔ احباب بدستور سوٹ یا بدیشی کپڑے کا بنا

کہ ”دیکھو بھائی ہندوستان کی آزادی ہم کو بھی اچھی معلوم ہوتی ہے، ہم خود بھی آزاد بننا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ہم قومی رہنما نہیں بن سکتے اور اگر بنیں گے تو نااہل ثابت ہوں گے اور ہماری نااہلی سے ان لوگوں کی خدمت پر برا اثر پڑے گا جو کامیابی کے ساتھ اس مقصد میں ساعی ہیں۔ ہم کو اپنے فرائض دیکھنا ہیں، اور ان کو پورا کرنا ہے ہم تعلیم حاصل کر رہے ہیں صرف اپنے لیے نہ کسی دوسرے کے لیے۔ ہماری تعلیم سے ہم کو اور ہمارے ملک کو فائدہ پہنچے گا۔ اور ممکن ہے کہ ہم تعلیم یافتہ ہونے کی صورت میں موجودہ صورت سے زیادہ مفید خدمات انجام دے سکیں۔“ لیکن ہماری اس بکواس پر مرزا نے کبھی توجہ کی اور آخر کار ایک دن ”بندے ماترم، انقلاب زندہ باد“ کہتے ہوئے اور ”جھنڈا اونچا رہے ہمارا“ گاتے ہوئے اسکول سے نکل ہی آئے۔

اسکول چھوڑنے پر گھر کے بڑے بوزھوں نے مخالفت کی اور ہماری طرح کے بہت سے احباب نے سمجھایا مگر وہ تو گویا یہ طے ہی کر چکے تھے کہ آئندہ سال کانگریس کا صدر منتخب مجھ ہی کو ہونا ہے اور جس وقت میری ”جے“ کے نعرے بلند ہوں گے یہ مخالفت کی آوازیں خود بخود دب جائیں گی، لہذا ان کے فیصلہ کے آگے کسی کی نہ چلی اور انھوں نے ایک ملکی رہنما کی سی زندگی شروع کر دی۔ کوٹ پتلون، شیروانیاں، ٹوبیاں قیص پا جائے ایک ایک کر کے نذر آتش کر دیے گئے اور شہر بھر میں جو سب سے موٹا کھدر دستیاب ہو۔ کا اس کا کرتا پا جامہ اور ٹوپی بنائی گئی۔ بجائے بوٹ کے وہی بارہ آنے والی چپل خریدی گئی جو تارکین موالات پہنا کرتے ہیں اور اب وہ صورتانے یکے لیڈر معلوم ہونے لگے۔ لیکن ان کی شدت پسندی کے نزدیک یہ انقلاب گویا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ جس زمین پر چلتے ہیں اور جس آسمان کے نیچے رہتے ہیں، یہ سب کھدر کے ہو جائیں۔ اگر ان کا بس چلتا تو کھدر کھانا بھی شروع

ہوا ہندوستانی لباس پہنتے تھے لہذا ان سے ترک موالات بھی لازمی ہوا۔ اب رہی ہونے والی سسرال، اس کا یہ حال تھا کہ انسانوں سے لے کر جانوروں تک لیے ہر چیز بدیشی مہیا کی جاتی تھی۔ خود وہ مسماۃ جن کی شادی مرزا کے ساتھ ہونے والی تھی ہر روز صبح کو انگریزی صابن سے منہ دھو کر انگریزی تولیہ سے پونچھتی تھیں اور انگریزی پوڈر لگا کر انگریزی آئینہ میں انگریزوں جیسا منہ دیکھتی تھیں پھر انگریزی تیل سر میں ڈال کر انگریزی کنگھی سے انگریزی مانگ نکالی جاتی تھی اور اس پر انگریزی کلپ لگائے جاتے تھے۔ اس کے بعد انگریزی کپڑے کی بنی ہوئی ساڑی اور انگریزی دکان کا سیاہوالبوز پہن کر انگریزی موزے اور انگریزی جوتا پہنے ہوئے انگریزی موٹر پر بیٹھ کر انگریزی بولتی ہوئی انگریزی اسکول جاتی تھیں۔ اور وہاں انگریزی کتابیں پڑھتی تھیں۔ اب بتائیے کہ وہ کس طرح مرزا کی بیوی بن سکتی تھیں۔ مرزا تو ہر مرتبہ بیوی کا تصور آتے ہی اس طرح ”لاحول ولا قوۃ“ پڑھتے تھے گویا تاریکین موالات کے شیطان کی یہی وضع قطع ہوتی ہے جو مرزا کی ہونے والی بیوی کی تھی۔ یا تو یہ حال تھا کہ شادی کی مقررہ تاریخوں میں ایک عزیز کا انتقال ہو گیا تھا اور شادی کی تاریخ بڑھ گئی تھی تو ان کی روح تک سے متنفر تھے۔ وہ تو یہ کہیے کہ یہ حرکت ایک مرحوم کی تھی اگر کسی ”ایس جہانی“ نے اس طرح اسی طرح شادی میں رکاوٹ ڈالی ہوتی تو مرزا مرزا اس کی اور اپنی جان ایک کر دیتے۔ یا وہی نہ رہتا یا مرزا ہی نہ رہتے۔ لیکن مرے ہوئے کے ساتھ کیا کر سکتے تھے بہر حال یہ تو طے تھا کہ خدا کے یہاں بدلہ ضرور لیں گے۔ یا تو یہ زور شور تھا یا اب یہ حال تھا کہ شادی کے نام سے ان کو تنفس کا دورہ نہ اٹھتا تھا اور اس طرح جلد جلد پہلو بدلنا شروع کرتے تھے۔ گویا کسی اڑیل ٹوکھو کو نئے سے باندھ کر بنر لگائے جا رہے ہیں۔ بات اصل میں یہ تھی کہ اس تبدیلی نے شادی کے معاملہ میں بھی معیار انتخاب بدل دیا تھا۔ اب وہ ایک برق جسم ایک شعلہ لرزاں

معطر ریشم میں لپٹی ہوئی حسین تیزی کو اپنے رفیقہ حیات بنانا تو کجا اپنی رفیقہ حیات کی خادمہ بھی بنانا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا ”سرو قد“ ہونا ان کی نظروں میں کھٹکتا تھا اور وہ کہتے تھے کہ کاش یہ ”کپاس قد“ ہوتی۔ اس کے سنہری ریشم کی طرح ملائم بال بھی ان کو اچھے نہ لگتے تھے غالباً وہ چاہتے ہوں گے کہ سوت کی طرح موٹے بال ہوتے اس لیے کہ جن باتوں میں بد-بشیت ہو یا بد-بشیت کی بو بھی پائی جائے اس سے ان کو تنفر ہو گیا تھا۔ خواہ وہ ان کی ہونے والی بیوی کا حسن ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی شدت پسندی نہیں رہتی بلکہ اس کی ایک طوفانی کیفیت ہوتی ہے کہ الفاظ کی صورت میں نقل و حرکت کی شکل میں اس کا اظہار ہوتا ہی رہتا ہے اور بالکل مدوجز کی سی حالت ہوتی ہے۔ چنانچہ شادی کا معاملہ میں بھی مرزا نے سودیشی جوش میں آ کر اپنے گھر میں کہہ دیا کہ میں جیلہ کے ساتھ شادی نہ کروں گا حالانکہ گھر میں کسی کو مرزا کے اس انکار کی توقع نہ تھی لیکن یہ الفاظ سن کر کسی کو تعجب بھی نہ ہوا۔ اس لیے کہ تمام گھر ان کی سودیشی ادائیں دیکھ کر ان کے دماغ کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ پھر بھی شادی کا معاملہ ایسا تھا کہ یہ الفاظ سن کر سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اس لیے کہ جیلہ بھی کوئی غیر نہ تھی۔ مرزا کی حقیقی پچازاد بہن تھی۔ اس انکار سے اول تو اس کی بدنامی، دوسرے خود مرزا کے والد محترم کو یہ گوارا نہ تھا کہ مرزا کی اس جسارت کو خاموشی کے ساتھ نال دیا جائے اور غریب جیلہ کو بدنام ہونے دیا جائے۔ انھوں نے مرزا کو سمجھایا اور خوشامدیں کیں، غصہ کیا، خفا ہوئے، برا بھلا کہا۔ خود گھر سے نکلنے کی دھمکی دی، گھر سے نکالنے کو کہا، صورت نہ دیکھنے کے عزم بالجزم کا اعلان فرمایا، عاق کر دینے کے ارادے کا اظہار کیا۔ لیکن مرزا نے ہر بات کا جواب اس سکوت کے ساتھ دیا جس میں لوگ منہ پھلا کر دل ہی دل میں گالیاں دیا کرتے ہیں۔ جب والد صاحب قبلہ اپنے فرما تیر دار نور نظر کو ہر طرح سے ڈرا دھمکا چکے تو والدہ محترمہ نے اپنے لخت جگر کو رو کر،

کہنے لگے۔ ”ہماری شادی کا؟“

ہم نے کہا۔ ”ہاں تمہاری شادی کا۔ سنا ہے کہ تم کو کچھ پس و پیش ہے۔“
 کہنے لگے۔ ”بھائی تم خود سمجھدار ہو اور تم نے میری فطرت کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ تم خود بتاؤ کہ جس لڑکی سے میری شادی طے ہوئی ہے اس سے میرا نباہ کیسے ہوگا؟“

ہم نے کہا۔ ”یہ تو صحیح ہے مگر کیوں؟“

کہنے لگے۔ ”بھائی یہ تو موٹی سی بات ہے کہ میں قوم کا خادم بن جانے کے بعد بیوی کا خادم بننے کے قابل نہیں رہا۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ کیا؟“

کہنے لگے۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ میری اور اس لڑکی کی معاشرت میں وہی فرق ہے جو ہندوستانیوں اور انگریزوں کی معاشرت میں ہوتا ہے۔“
 ہم نے کہا۔ ”تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ انگریزی پڑھتی ہے اور تم نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ تم گاڑھا اور کھدر پہنتے ہو اور وہ.....“

کہنے لگے۔ ”بعض اوقات تم بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میرے اور اس لڑکی کے درمیان یہی فرق ہے کہ میں آزادی کا شیدائی ہوں اور وہ غلامی کی دلدادہ۔ جتنی چیزیں میرے لیے باعث نفرت ہیں وہ سب اس کے لیے باعث رغبت۔ مجھ کو کھدر سے عشق اور اس کو کھدر سے نفرت اب آپ ہی بتائیے کہ ”چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔“

ہم نے کہا۔ ”صحیح ہے۔ بجا ہے۔ درست!“

کہنے لگے۔ ”میں کیا کروں شادی کر کے۔“

ہم نے کہا۔ ”لیکن شادی کرنے سے گویا تم قوم پرستوں میں ایک اور

گڑگڑا کر، ہاتھ جوڑ کے دودھ نہ بننے کا الٹی میٹم دے کر اپنے مرنے کا عبرت انگیز بیان اور ایک تمنا کو لیے ہوئے قبر میں جانے کا درد انگیز ذکر کر کے اپنے سر کی قسم دے کر ”اولاد ماں باپ کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتی“ کے موضوع پر ایک وعظ نما تقریر کر کے حکم دیا، استدعا کی، اکڑ کے کہا اور ہاتھ جوڑ کے کہا کہ ”بیٹا ایسا غضب بھی نہ کرتا، بڑھے ماں باپ کا منہ کالا ہو جائے گا۔ صورت دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔“ لیکن ہمارا مرزا کچھ ایسا ویسا نہ تھا جس کو یہ سبز باغ دکھا کر گیدڑ بھجکیوں سے ڈرا کر قابو میں کیا جاتا۔ وہ شیر کی طرح مخالفت کے طوفان کا مقابلہ کرتا رہا اور ہر مصیبت کے جھیلنے پر آمادہ رہا۔

مرزا کے والد ہمارے بڑے قائل تھے کہ ہم کو اپنے اشاروں پر مرزا کو چلانا ایسا آتا ہے جیسے بندر والا بندر کو اشاروں سے نچاتا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک مرزا کا صرف یہ علاج رہ گیا تھا کہ ہم بھی ان سے کہیں کہ ”مان جاؤ۔“ چنانچہ ہم کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ مرزا کو ہموار کریں حالانکہ ہم جانتے تھے کہ مرزا کو جس مرض کا دورہ اٹھا ہے اس کا علاج خود مہاتما گاندھی کے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن ان کے والد کے حکم کی تعمیل ضروری تھی اور ایسی صورت میں جب کہ وہ اپنی تمام پداری طاقتوں کا استعمال کر چکنے کے بعد ہماری طرف امداد طلب نظروں سے دیکھ رہے ہوں، چنانچہ ہم تاحصانہ الفاظ پر اس طرح غور کرتے ہوئے جیسے شعراء راستے میں شعر کہتے ہیں، مرزا کے پاس پہنچے اور سودیشی تحریک کے فوائد پر ایک ایسی تقریر کی کہ مرزا کی باچھیں کھل گئیں۔ دیر تک ہماری ذہانت، عقلمندی، قابلیت، سنجیدگی اور روشن دماغی کی تعریفیں کرتے رہے۔ جب ہم نے یہ دیکھا کہ اب ذرا خوش ہیں اور امید ہے کہ منہ مانگی مراد ملے تو ہم نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”ارے یار یہ کیا قصہ ہے تمہاری شادی کا؟“

اضافہ کرو گے۔“

اُچھل کر کہنے لگے۔ ”وہ کیسے؟“

ہم نے کہا۔ ”وہ اس طرح کہ اگر تم جیلہ ہی سے شادی کر کے اس کو اپنی راہ پر لگالائے تو گویا تم نے رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ بجائے اس کے کہ جیلہ کو اپنی ملکیت بنا کر اس کو اپنی مرضی کے مطابق بناؤ کیا تم یہ گوارا کرتے ہو کہ وہ کسی سرکار پرست فیشن سہیل کی بیوی بنے اور اس کی اصلاح نہ ہو سکے؟“

گردن ہلا کر بولے۔ ”تم نے بات تو ایسی کہی ہے کہ میں قائل ہو گیا۔ مگر تم کو نہیں معلوم کہ وہ صاحبزادی کس ماحول میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ مجھ کو گویا ذہنیت تبدیل کرنا پڑے گی۔ گویا عادتیں تبدیل کرانا پڑیں گی مختصر یہ کہ جیلہ کو ایک سرے سے تبدیل کرنا پڑے گا لہذا میں ایسی ہی شادی کیوں نہ کروں جس کو تبدیل کرنا نہ پڑے۔“

ہم نے کہا۔ ”تو پھر کمال ہی کیا ہوا؟ کمال تو یہ ہے کہ ان ہاتھوں سے جو پیانو بجانے کے عادی ہیں چرخہ چلواؤ۔ ان پیروں میں جو لمبی ایڑی کے جوتے میں رہ کر آہو خرائی کی مشق کر چکے ہیں چپل پہناؤ۔ اس جسم کو جس کی نزاکت ریشم کے بوجھ کی بھی بمشکل تحمل ہوتی ہے کھدر کا عادی بناؤ۔ غرض کہ اپنے رنگ میں اس کو رنگ کر بجائے ”میڈم“ کے اپنی بیوی یعنی ”شریمتی“ بناؤ۔ اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھنا کہ تمہارا دل ایسا مطمئن ہو جائے گا گویا ہندوستان کو چاہے ملا ہو یا نہ ملا ہو لیکن تم کو سورا ج مل گیا۔“

ایک وجدانی کیفیت کے ساتھ کہنے لگے۔ ”یار بچ بتاؤ کہ آج تم اتنی معقول باتیں کیسے کر رہے ہو۔ میں نے تو کبھی تمہارے متعلق اتنی اچھی رائے قائم نہ کی تھی جیسے تم آج ثابت ہوئے۔ اتنے زبردست دلائل، ایسی سلیبی ہوئی باتیں، اللہ اکبر،

داماد

141

بند سے ماترم، بھارت ماتا کی ہے، سبحان اللہ! بخدا دل چاہتا ہے کہ تمہارے ایک ایک لفظ کو اپنا خط تقدیر بنالوں۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں بالکل سچ سمجھو اور یقین جالو کہ میں صرف تمہارے ان الفاظ کے ساتھ شادی کر رہا ہوں جیلہ کے ساتھ نہیں، اور سنو کہ میں اب شادی پر اور غیر مشروط شادی پر بالکل آمادہ ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ جو تم کہو میں تیار ہوں۔“

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اپنی لسانی کی داد دوں یا مرزا کی بے وقوفی کی۔ بہر حال دونوں کو نصف نصف سمجھ کر میں اپنی کامیابی پر خوش ہوتا ہوا مرزا کے والد کے پاس پہنچا اور ان کو یہ مرثہ سنایا۔ وہ سنتے ہی میری طرف بڑھے۔ میں سمجھا کہ جذبات شکر گزاری سے بے خود ہو کر میرے قدموں میں گر پڑیں گے، میں ذرا پیچھے ہٹ گیا لیکن انھوں نے جھپٹ کر گلے سے لگایا اور دیر تک تعریفیں کرتے رہے۔ گھر میں خبر پہنچی تو مرزا کی والدہ نے دعا کہا ابھی اور خاصدان میں پان۔ غرض کہ اس دن ہم ہی ہم تھے۔ ہر طرف سے مرزا کے نوکروں، چاکروں، ماماؤں، ملازماؤں، عزیزوں، رشتہ داروں کی انگلیاں ہماری ہی طرف اٹھ رہی تھیں اور ہم کو اس کامیابی پر محسوس ہو رہا تھا گویا خود ہماری شادی ہے۔ مرزا تو خیر جب دولہا نہیں گے دیکھا جائے گا، لیکن اس وقت تو ہم کو یہ درجہ حاصل تھا۔

مرزا کی شادی کا تمام سامان پہلے ہی سے تیار تھا۔ بس مرزا کے ”ہوں“ کرنے کی دیر تھی جس کے بعد دعوت نامہ تقسیم ہونا شروع ہو گئے اور آخر وہ مرحلہ بھی طے پا گیا جس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ہماری خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ مرزا گو دولہا بنے مگر کھدر پوش، جیلہ دلہن بنی مگر بدیشی دلہن۔ لیکن مرزا کو قطعاً اعتراض نہ ہوا اس لیے کہ وہ سمجھتے ہوئے تھے کہ یہ کافر مسلمان ہو کر رہے گا۔ چنانچہ ہنسی خوشی شادی کے تمام رسوم پورے ہوئے۔ دلہن رخصت ہو کر آگئی اور مرزا کے مکان سے رفتہ رفتہ

شادی کی فضا میں دور ہونے لگیں۔ چوتھی ہوئی، چالے ہوئے اور آخر کار مرزا کا مکان مہمانوں سے خالی ہو گیا۔ اس کے علاوہ کہ پہلے مرزا مردانے مکان میں رہتے تھے اب زمانے مکان میں رہنے لگے اور باقی حالات بدستور سابق ہو گئے۔

مرزا کے متعلق اتنا اندازہ تو ضرور ہوا کہ غیر مطمئن نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نہ کھلے اور نہ ہم نے پوچھا، اس لیے کہ ہماری حیثیت ایک ناصح مشفق کی تھی لہذا ہمارا خود سے سوال کرنا ذرا ہماری پوزیشن کے خلاف تھا لیکن ہمارا دل ضرور چاہتا تھا کہ بدیشی دہن کے اس سودیشی دولہا سے پوچھیں تو کہ کسی گزر رہی ہے؟ لیکن ہم منتظر تھے کہ یہ حضرت خود کچھ فرمائیں۔ آخر انھوں نے خود ایک دن فرمایا۔

”بھائی ہماری بیوی تو پکی نیشلسٹ ہو سکتی ہے لیکن ابھی اس کی ذہنیت کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”تو پھر تبدیل کر ڈالو نا۔“

کہنے لگے۔ ”ذرا صبر کرو۔ رفتہ رفتہ سب ہو جائے گا۔ دیکھئے گا مرزا کی بیوی کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بات تو جب ہے کہ تم سے پہلے تمہاری بیوی جیل جائے۔“
کہنے لگے۔ ”انشاء اللہ..... مگر نہیں یا رخصت کرے، اس لیے کہ میں اس کو ذرا برا سمجھتا ہوں۔“

ہم نے کہا۔ ”اس میں برائی کیا ہے۔ کیا قوم کے لیے قربانی عورت نہیں کر سکتی؟“

کہنے لگے۔ ”یہ تو ٹھیک ہے مگر جیل کے داروغہ سے لے کر چرائی اور سپاہی تک بلکہ تمام قیدی سب اس کے لیے نامحرم ہوں گے اور وہ ٹھہری پردہ نشین۔“
ہم نے کہا۔ ”واہ حضرات واہ! اگر محرم نامحرم کا امتیاز آپ نے بیوی کے

معاملہ میں کیا تو کر چکے آپ قوم کی خدمت۔“
کہنے لگے۔ ”بھائی تو بتاؤ آخر کیا کروں۔ خود تو میں جیل میں نہیں جہنم میں جانے کو تیار ہوں لیکن..... لیکن..... لیکن۔“

ہم نے کہا۔ ”خیر معلوم ہو گیا کہ آپ بیوی کو قوم کی دای نہ بننے دیں گے۔ اچھا تو یہ بتاؤ کہ وہ تمہارے کھدر سے ناخوش تو نہیں ہیں؟“

کہنے لگے۔ ”ناخوش تو خیر نہیں ہیں لیکن وہ چاہتی ہیں کہ جب ان کی کوئی اسکولی سہیلی یا استانی وغیر ان سے ملے آئے تو وہ ایک سوٹ پہنے ہوئے شخص کو اپنا شوہر بتائیں اور کھدر پہننے کی حالت میں ان کو ذرا پس و پیش ہوگا۔ بھائی بات اصل میں یہ ہے کہ خود ہماری بیوی نے ہمارے درد قومی کا احساس کر لیا تو کیا دنیا بھر ہمارے کھدر کو دیکھ کر ہم کو معز آدی سمجھے گی۔ سب تو یہی سمجھیں گے کہ ہوگا کوئی جولا یا وغیرہ۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ تو یا تم غلط کہتے ہو۔ اس وقت کھدر پہننا بھی ایک قسم کی عیاشی ہے۔ جس کو بڑا آدمی بننا ہو وہ کھدر پہن لے۔ یوں سوٹ پہننے کے تو اس سے زیادہ قیمتی سوٹ پہنے ہوئے دوسرے بھی نظر آئیں گے لیکن جہاں تک کھدر کا تعلق ہے ع

”یہ وہ جامہ ہے جس کا نہیں الٹا سیدھا“
کہنے لگے۔ ”مگر بھائی عورتیں ناقص العقل ہوا کرتی ہیں، ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ سکتیں۔“

ہم نے کہا۔ ”تو پھر ایک آدھ سوٹ بنو اور وقت پر کام آئیں گے جس طرح ہم نے ایک آدھ کھدر کی شیر دانی رکھ چھوڑی ہے۔“
کہنے لگے۔ ”اماں بھائی بنو اتنی ہی پڑے گا لیکن دل نہیں چاہتا کہ اس چیز کو

ہم نے کہا۔ ”اچھا ابھی لو۔ کیوں خیریت تو ہے؟“

کہنے لگے۔ ”آج تمہاری بھانجہ کے اسکول میں جلسہ ہے جس میں، میں بھی مدعو ہوں۔۔۔۔۔ لاؤ نائی باندھتا جاؤں اور کہتا جاؤں ورنہ دیر ہوگی۔۔۔۔۔ ہاں تو وہاں میں بھی مدعو ہوں اور میرے سوٹ سب جل چکے۔ نئے ابھی تیار نہیں ہوئے لہذا مجبوراً تمہارا سوٹ پہن رہا ہوں۔۔۔۔۔ ارے یار قمیض بھی تو دو، واپس آ کر ابھی بھیجے دیتا ہوں۔“

تھوڑی دیر میں ہمارے کھدر پوش شریمان مرزا جی یار قمیض الاحرار مولانا مرزا صاحب ایک باقاعدہ جنتلمین نظر آنے لگے۔ ہم کو خیر اس انقلاب پر حیرت ہو رہی تھی لیکن مرزا نے آئینہ دیکھ کر کمال کر دیا۔ فرمانے لگے۔

”برا تو نہیں معلوم ہوتا سوٹ میں۔ میں سمجھتا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد برا لگے گا۔“

●●

ہاتھ لگاؤں جس کو حرام سمجھ لیا تھا۔“

مرزا سے گفتگو کرنے کے بعد اس کا اندازہ تو ہم کو ہو ہی گیا تھا کہ اب یہ بہرہ و بدلے والے ہیں۔ لیکن ہم کو امید تھی کہ اگر اس دوران میں کوئی قومی جلسہ ہو گیا یا کسی لیڈر کا لکچر سننے کا مرزا کو اتفاق ہوا تو بہت ممکن ہے کہ رائے بدل جائے اس لیے کہ لیڈر تو لیڈر ہم ایسے غیر لیڈر نے ان کے ارادوں میں کیسی تبدیلیاں پیدا کر دیں اور ہم تو ہم ایک عورت ذات نے کیسا ان حضرت کا نٹو پھیرا کہ اب ہر بات جو پہلے حرام تھی حلال ہو گئی ہے۔ یا تو یہ امید تھی کہ یہ ذات شریف اس غریب لڑکی کو بھی، جس کے کھانے پہننے کے دن ہیں، اپنی طرح کھدر پوش بنادیں گے۔ اور اگر زیادہ جوش آگیا تو اب کی بدلی ہوئی میں بیوی کا تمام جہیز نذر آتش کر دیا جائے گا۔ لیکن وہاں تو دنیا ہی بدل گئی۔ دو باتیں جو اس نئی نویلی لہن نے کہیں تو میاں صاحب کی تمام ”سودیت“ رفو چکر ہو گئی۔ بڑے بڑے دعوے تھے بڑے ضدی بنتے تھے، اپنے عزائم پر بہت ناز تھا، باپ تک کی نہ سنتے تھے، یا اب یہ حال ہے کہ گویا بیوی نے کوئی جادو کر دیا۔ اگر بیوی بنگالن ہوتی اور پراتا زمانہ ہوتا تو خیر کوئی تعجب نہ تھا اس لیے کہ وہاں کی عورتیں آدمیوں کو تیل بنا دینا باتیں ہاتھ کا کھیل سمجھتی تھیں۔ لیکن یہاں تو نہ کوئی جادو تھا نہ سحر، یونی سیدھے سادھے الفاظ سے مرزا کو ایسا مجبور کیا گیا تھا گویا کھونٹے سے باندھ دیا ہو۔

مرزا کی جدید تبدیلی کے ہم منتظر تو ضرور تھے لیکن یہ امید ہم کو بھی نہ تھی کہ وہ ایک دن ہانپتے کانپتے ہمارے پاس آئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہنے لگے۔

”ارے میاں اپنا وہ سرج والا سوٹ اور کالر چک نائی معہ رومال اور ٹائٹ کیپ جلدی سے دے تو دو۔“

ہو جاتی ہے۔ وہی ہوا میں قلعے بننا شروع ہو جاتے ہیں اور وہی بیداری میں خواب کا عالم ہو جاتا ہے۔

ہم کسی کو کیوں کہیں، خود ہمارا یہ حال ہے کہ خود تو تمام دنیا کی اس حرکت پر منتے ہیں لیکن جب کبھی ہم پر یہ دور پڑتا ہے تو گھنٹوں اس طرح پڑے رہتے ہیں کہ ٹھکی ہوئی آنکھیں عجیب و غریب مناظر دیکھتی ہیں۔ دماغ ان مناظر کو اور بھی دلغریب بنا کر اصلیت کے باور کرنے کا فریب دیتا ہے اور ہم اپنی چار پائی پر لیٹے ہوئے اس طرح لیٹے ہوتے ہیں گویا نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے کہ دفتر میں تعطیل ہو۔ بیوی میسے گئی ہوئی ہوں، بارش کی وجہ سے باہر نہ نکل سکتے ہوں اور کمرہ میں، ہو کا عالم ہو۔ اس وقت ہم پہلے تو بارش سے لطف اندوز ہوں گے، پھر کسی کے خط کا انتظار کریں گے، پھر خط آنے کے امکانات پر غور کریں گے۔ یہاں تک کہ ان کا خط لکھنا لکھ کر ڈاک میں ڈالنا ڈاک کا چلنا چل کر پہنچنا، پہنچ کر تقسیم ہونا، تقسیم ہو کر ہم کو ملنا وغیرہ سب ہمارے پیش نظر اس طرح ہو جائے گا کہ ہم ان مناظر میں کھو کر بس کہیں کے نہ رہیں گے اور جب بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک سے چونک کر ہوشیار ہوں گے تو خود اپنے کو چار پائی پر پت لیٹا ہوا پائیں گے۔ اب اس کیفیت کو چاہے چنک کہہ لیجئے چاہے فلسفیانہ محویت، بہر حال کیفیت یہی ہوتی ہے جس کے مختلف نام ہیں۔

کل ہم کو بھائی زیر کے خط کا انتظار تھا اور اتفاق سے تمام حالات وہی تھے جو ہم کو دوسرے عالم میں آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں، یعنی چھٹی بھی تھی اور ہم لیٹے بھی تھے، بیوی بھی سو رہی تھیں، اور ہم بارش کے سبب سے باہر بھی نہ جاسکتے تھے لہذا ہم نے ڈاک کے انتظامات پر غور کرنا شروع کر دیا کہ اگر خود ہمارے سپرد یہ انتظام کر دیا جائے تو ہم کیا اصلاحات کریں اور اسی غور و فکر میں موجودہ نظام اور سوراخ

سودیشی ڈاک

ہمارے خیال میں فلاسفر اور افیونی سب ایک ہی تھیلی کے چنے بٹے ہیں، فرق صرف اس قدر ہے کہ بے چارے افیونی تمام دنیا سے علیحدہ رہ کر ایک گوشے خاموش میں رہ

”یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے“

کے اصول کو پیش نظر رکھ کر بس ایک پیالی کے مشغلہ میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں اور ان کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ اس پیالی کو اپنے اوپر طاری کر لیں اور خود اس میں ڈوب جائیں۔ ان کو دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور نہ دنیا ان کو کچھ سمجھ سکتی ہے لہذا ان کی فلسفیانہ محویت کا نام دنیا والوں نے ”چنک“ رکھا ہے۔ بالکل یہی حال ان پڑھے لکھے لوگوں کی محویت کا ہوتا ہے جن کو ہم فلاسفر کہتے ہیں لیکن چونکہ ان کے متعلق سب جانتے ہیں کہ یہ زندگی بھر فلسفہ کی کتابیں چاٹا کیے ہیں لہذا ان کی چنک کو لوگ فلسفیانہ محویت کہتے ہیں۔

افیونی اور فلاسفر تو خیر محویت کے لیے مخصوص ہیں لیکن ہم سچ کہتے ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ بہت سے لوگ ہماری تائید کریں گے کہ دنیا کا ہر ذی ہوش انسان جس وقت محویت کا شکار ہو کر عالم تخیل میں کھو جاتا ہے اس کی حالت کسی طرح ایک تجربہ کار افیونی اور ایک ماہر فلسفہ سے کم نہیں ہوتی۔ وہی چنک کی کیفیت پیدا

چاہا تو پوسٹ کارڈ بھی لیں گے۔“

وہ:- ”لاؤ دام، ہم دیتے ہیں سب ابھی۔“

ہم:- ”نہیں آپ تکلیف نہ فرمائیے آپ تو صرف ڈاک خانہ بتا دیجئے، ہم خود خرید لیں گے۔“

وہ:- ”آپ کیا کہیں باہر سے آئے ہیں؟“

ہم:- ”جی نہیں خاکسار کا غریب خانہ خاص یہیں ہے۔“

وہ:- ”تو آج تک آپ کو نہیں معلوم ہوا کہ ڈاک خانہ کہاں ہے؟“

ہم:- ”معلوم کیوں نہیں پہلے یعنی کل تک تو یہیں تھا معلوم نہیں رات بھر میں کدھر کو چلا گیا۔“

وہ:- ”واہ جناب واہ آپ بھی عجیب دل لگی باز معلوم ہوتے ہیں۔ ابھی لائیے پیسے میں دوں آپ کو ٹکٹ وکٹ۔“

ہم:- ”لیکن ہم کو تو خط پر لگانے والے یعنی ڈاک ٹکٹ چاہیے ہیں۔“

وہ:- ”معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو لینا دینا نہیں ہے۔“

ہم:- ”لینا کیوں نہیں ہے مگر کس سے لیں۔ آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں۔“

وہ:- ”جناب کہہ تو رہا ہوں کہ مجھ سے لیجئے، میں دیتا ہوں مگر آپ کو تو مذاق سوچ رہا ہے۔“

ہم:- ”اور آپ کون ہیں؟“

وہ:- ”میں پوسٹ ماسٹر صاحب کا بھانجا ہوں اور شاید شام تک سب پوسٹ ماسٹر ہوجاؤں۔“

ہم:- ”تو یہ آج آپ کے یہاں جمع کیسا ہے؟“

مل جانے کے بعد والا انتظام ہماری نظروں کے سامنے تھا، یہاں تک کہ ہم کو ڈر لگنے لگا کہ اگر آج ہی سوراج مل گیا تو کیا جو خط آنے والا ہے وہ نہ آسکے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اور تو سب کچھ ہم بھول گئے بس سودیشی ڈاک ایک مکمل نقشہ ہمارے پیش نظر ہو گیا۔

”خط لے کر جو ڈاک خانہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس عمارت میں ترکاری منڈی آئی ہے اور ڈاک خانہ کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے لیکن سائن بورڈ بدستور وہی لگا ہے ”پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف آفس“ اور کھڑکیوں پر تختیاں بھی وہی ہیں ”ٹکٹ یہاں بکتے ہیں“ ”تاریں“ ”منی آرڈر“ ”ویلوپی اسبل“ ”سیونگ بینک“ ”پارسل“ ”رجسٹریشن“ ”پوسٹ ماسٹر“ ”تھو کنا منع ہے“ ”اندر آنے کی اجازت نہیں“ وغیرہ وغیرہ لیکن حال یہ ہے کہ کوئی تین سو آدمی اس کمرے میں کھڑے غل بچار ہے ہیں جس کے دروازے پر لکھا ہوا ہے کہ ”اندر آنے کی اجازت نہیں“ اور جہاں کل تک برقی پنکھے کے نیچے ایک بابو جی تاک پر بینک لگائے بیٹھے رہتے تھے آج نہ تو وہ دکھائی دیتے ہیں اور نہ دوسرے بابو نظر آتے ہیں۔ سب کی جگہ پر کچھ لوگ موجود ہیں لیکن ان کا تعلق ڈاک خانہ سے نہیں معلوم ہوتا، بلکہ رہ رہ کر یہ شبہ یقین کی حد تک پہنچتا جاتا ہے کہ کسی کباز نے، نے اپنی لڑکی کی شادی کے لیے یہ جگہ مانگ لی ہے اور اس میں سب برائی ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ عارضی طور پر کسی بہر حال ڈاک خانہ کو کہاں منتقل کر دیا۔ ہم نے ہر طرف نظر دوڑائی لیکن کہیں ڈاک خانہ کے آثار نظر نہ آئے۔ مجبور ہو کر انہی براتیوں میں سے ایک سے پوچھا کہ ”بھائی ڈاک خانہ آج کہاں ہے۔“

وہ:- ”کیوں مطلب کیا ہے؟“

ہم:- ”مطلب یہ ہے کہ خط ڈالیں گے، ٹکٹ لیں گے، الفافے لیں گے اور دل

وہ:- ”سب اپنے اپنے کام سے آئے ہیں جیسے آپ، اچھالا یئے دام۔“
 ہم:- ”اچھا دو پیسہ والا ٹکٹ دے دیجئے اور.....“
 وہ:- ”دو پیسہ والا ٹکٹ نہیں ہے کہیے تو پانچ پیسے کے دو والے دے دوں،

ہاں اور کیا؟

ٹکٹ کے یہ نئے دام سنتے ہی بجائے اس کے کہ ہم کچھ اور کہتے ہم نے ایک مرتبہ جلدی جلدی اپنے گرد و پیش اور نیچے نظر دوڑائی کہ ہم کہاں ہیں، ان حضرات کو سر سے پیر تک اور پیر سے سر تک بغور دیکھا اور سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد بس منہ کھول کر رہ گئے، ان حضرات نے فرمایا:- ”ہاں تو اور کیا؟“

ہم نے جواب دیا:- ”پہلے یہ بتائیے کہ ہم سو رہے ہیں یا آپ مذاق کر رہے

ہیں؟“

انھوں نے ہمارا یہ جملہ سن کر کچھ منہ بنایا، پھر ایک گھونٹہ اپنی میز پر مارا اور زیر لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے ایک طرف کو چلے گئے۔ ہم نے کچھ دیر تو ان کی واپسی کا انتظار کیا لیکن جب وہ نہ آئے تو ہم نے ایک قریبی دوکان سے پان لینے اور اسی سلسلہ میں پان والے سے تحقیقات کرنے کا ارادہ کیا اور ہم بھی چلے گئے۔ پان والے سے پوچھا تو اس بے چارے نے ایک ہمدردی کی طرح بس اتنا بتا دیا کہ:-

”حضور ڈاک خانہ تو یہی ہے مگر آج کانگریس والوں کو سوراخ مل گیا ہے تو انھوں نے اپنا قبضہ کر لیا ہے اور سب بابوؤں کو ہٹا کر نئے آدمی رکھے ہیں اور سب ٹکٹ لفافے جلا کر نئے لفافے منگائے ہیں آج صبح سے بڑا ہلوا مچا ہوا ہے۔“

پان والے کے بیان سے بہر حال ہم ایک نتیجہ پر پہنچ گئے اور ہم کو شوق ہوا کہ ڈاک کے اس جدید انتظام کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ لہذا ہم بھی ان ہی دو تین سو آدمیوں کی طرح بے دھڑک ”اندرا آئے کی اجازت نہیں“ کے اندر چلے گئے

اور غور سے دیکھنے لگے کہ ان لوگوں میں کون شخص از روئے قاعدہ پوسٹ ماسٹر ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر تک ایک ایک آدمی کی صورت غور سے دیکھنے کے بعد ہم نے ایک صاحب کا بازو پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

”آداب عرض جناب۔“

انھوں نے گھوم کر جواب دیا:- ”آداب عرض، کہیے۔“

ہم نے کہا:- ”کہیے اب خط بھیجنے کا کیا طریقہ ہے۔“

وہ:- ”خط لکھئے اور ٹکٹ لگا کر ڈال دیجئے اور کیا طریقہ ہے۔“

ہم:- ”اچھا پھر کیا ہوگا۔“

وہ:- ”ذرا ٹھہر جائیے میں آپ کو سب ابھی بتاتا ہوں پہلے ان لوگوں کو ٹکٹ

دے دوں۔“

ہم خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے اور تماشا دیکھنے لگے۔ ان حضرات نے ایک لکڑی کا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک مہر نکالی۔ اب ان کے چاروں طرف لوگ جمع ہو گئے۔ کوئی تو کہتا ہے:- ”بابو جی دو آنہ کے دوانی“ کسی طرف سے آواز آتی ہے:- ”چار لفافے ایک ٹکٹ دو کارڈ“ اور بابو جی ہیں کہ سب ٹکٹ کے نئے دام بتا کر کسی سے ایک آدھ پیسہ چڑھا کر کسی کے ساتھ ایک آدھ پیسہ کی رعایت کر کے کسی کے نام قرض کے کھاتے پر ڈال کر، کسی سے دام ملے نہ ہونے پر انکار کر کے، کاغذ کے پرزوں پر مہر لگا کر دے رہے ہیں اور دام لے کر صندوق میں رکھ رہے ہیں۔ اتنا ہم دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ پرانے ٹکٹوں کی جگہ یہ کاغذ کے پرزے استعمال ہو رہے ہیں جن پر مہر لگا کر دام لکھ دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح سادے کارڈوں اور لفافوں پر بھی مہر لگا کر دی جاتی ہے۔ اور وہ ڈاک کے لفافے اور کارڈ بن جاتے ہیں لیکن اب تک ہماری سمجھ میں یہ نہ آیا تھا کہ ان ٹکٹوں، لفافوں اور کارڈوں کی کوئی مقررہ قیمت کیوں

”اور تنخواہ کا کیا انتظام ہوگا۔“

وہ۔ ”ہاں یہ بات آپ نے اچھا کیا پوچھ لی، بھائی دیکھئے ابھی یہ کام بالکل نیا نیا ہمارے ہاتھ میں آیا ہے، ہم کو چاہیے کہ تنخواہ و تنخواہ کا خیال چھوڑ کر بس پہلے تو اس کام کو سنبھال لے جائیں پھر تو جو چاہیں گے لے لیں گے۔ ابھی تنخواہ کا معاملہ یہ ہے کہ آمدنی پر سب دار و مدار ہے۔ ہم اور آپ دو آدمی ہیں بس، اور ہم دونوں کو تمام آمدنی کا مالک سمجھنا چاہیے، پہلے تو خرچ نکال لیں گے پھر جو بچے گا اس میں سے ہم اور آپ آپس میں تقسیم کر لیں گے۔“

میں نے چونک کر کہا۔ ”یعنی اس کی آمدنی کہیں اور نہ جائے گی۔“
وہ۔ ”کہیں اور کیوں جانے لگی۔ محنت تو کریں ہم، جان دیں ہم، نکتہ بیچیں ہم اور آمدنی جائے کہیں اور۔“

ہم۔ ”تو آپ سے اور محکمہ ڈاک سے کیا تعلق ہے۔“

وہ۔ ”اُجی کوئی تعلق نہیں، تعلق کیسا ہم خود پورا محکمہ ہیں۔“

ہم نے اور زیادہ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”یعنی چہ۔“

وہ۔ ”بھائی اس کو اس طرح سمجھئے، دیکھئے میں سب بتائیے دیتا ہوں اور غور سے سن لیجئے۔ ابھی سمجھ جائے گا۔ اب جیسے یہ ہمارا ڈاک خانہ ہے۔ اس کے ہم مالک ہیں اب جو نکتہ وغیرہ ہم بیچیں گے اس کی آمدنی بھی ہماری ہے لیکن اسی آمدنی میں خرچ بھی کرتا ہے اب خرچ یہ ہے کہ جن لوگوں نے نکتہ وغیرہ لیے ہیں وہ خط لکھ کر ہمارے ڈاک خانہ میں ڈالیں گے اور ہمارا فرض ہے کہ ان کے خط جہاں کہیں کے ہوں وہاں پہنچوائیں، تو ہم یہ کریں گے جیسے کانپور کے خط اور کلکتہ کے خط ہیں اور لاہور کے خط ہیں اس طرح جہاں جہاں کے خط ہیں ان کو ہم جمع کرتے جائیں گے اور جب مہینہ پندرہ دن کے اندر وہ بہت سے ہو جائیں گے تو ان کو لے کر جہاں کہیں

نہیں ہے اس لیے کہ بابو صاحب پہلے خریداری کی حیثیت دیکھتے تھے پھر کچھ غور کر کے دام بتاتے تھے بلکہ یہ بھی کہتے تھے کہ ”آپ یہ دام دے دیجئے۔“ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ گویا وہ نکتہ خریدنے والے کا وزن دیکھ کر دام بتاتے تھے اور جو جی چاہا دام بتا دیے۔ کسی سے لفافہ کے دو ہی پیسے لے لیے اور کسی سے دو آنے لے لیے۔ ہم دیر تک یہی تماشا دیکھا کیے۔ آخر جمع گم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا اور بابو صاحب کو یکسوئی حاصل ہوئی تو وہ صندوقچہ بند کر کے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔

”ہاں بھائی صاحب معاف کیجئے گا، آپ کو بڑی دیر ہوئی مگر چونکہ مجھے بھی آپ سے باتیں کرنا تھیں اس لیے میں نے یہ زحمت دی۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی مضائقہ نہیں۔“

کہنے لگے۔ ”میں نے آپ کو اس لیے روک لیا کہ آپ کی صورت سے مجھ کو یہ اندازہ ہوا کہ آپ میرے مطلب کے آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ میرا ساتھ دے کر میری مشکلوں کو آسان کر دیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”فرمائیے فرمائیے، میں بسر و چشم حاضر ہوں۔“

کہنے لگے۔ ”آپ اگر آج کل بے کار ہوں تو تھوڑے دنوں کے لیے اسٹنٹ پوسٹ ماسٹر بن جائیں۔ میں خود پوسٹ ماسٹر ہوں اور میرا بھانجہ بھی میرے ساتھ کام کرتا ہے لیکن وہ پھر بھی بچہ ہے اور یہ کام ہے بڑی سمجھ بوجھ کا، لہذا میں نے آپ کی صورت دیکھتے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ ہی یہ کام کر سکتے ہیں اور آپ ہی میرے مطلب کے ہیں۔“

بے کاری تو ہے ہی بری چیز، اب اس وقت سوچنے اور غور کا کیا موقع تھا۔ ہم نے فوراً اس عہدے کے قبول کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے پوسٹ ماسٹر صاحب سے عرض کیا کہ

کے وہ ہیں وہاں ایک ایک آدمی کو بھیج دیں گے۔ جیسے کانپور کے دو ہزار خط جمع ہو گئے ہم ان کو لیں گے اور ایک آدمی کے ہاتھ کانپور بھیجوا دیں گے، وہ آدمی کانپور جا کر ان خطوں کو کسی ایسے ڈاک خانہ میں دے دے گا جہاں ہمارے معاملات ہیں یعنی جس کے خط ہمارے یہاں آتے ہیں جس طرح ہم اس کے خط اپنے آدمیوں کے ہاتھ یہاں تقسیم کراتے ہیں، اسی طرح وہ ہمارے خط اپنے آدمیوں سے تقسیم کرا لے گا۔ اب اس آدمی کے کانپور جانے اور آنے کا کرایہ اور اس کی تنخواہ یہ ہے وہ خرچ جو ہم کو اسی آمدنی سے دینا ہوگا۔ اسی طرح ہم کو مختلف مقامات پر آدمی بھیجنا پڑیں گے اور یہاں بھی خط تقسیم کرنے کے لیے آدمی رکھنا پڑیں گے اس لیے کہ اگر ہم خط تقسیم نہ کرائیں تو دوسرے ڈاک خانہ والے ہمارے خط کیوں تقسیم کرانے لگے۔ اب ان تنخواہوں اور کرایوں سے جو بچے گا وہ ہمارا اور تمہارا ہے تو بھائی اس میں مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنا پرایا اگر سمجھو گے تو کام کیسے ہو سکتا ہے۔“

ہم نے ڈاک کا انتظام بخوبی سمجھ لیا اور یقین ہو گیا کہ اس میں نقصان ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی اس لیے کہ جب ڈاک خانہ کے تنبا مالک ہم ہی دونوں ہیں تو جو چاہیں گے کریں گے۔ آمدنی ایسی ہے جو رک ہی نہیں سکتی لہذا ہم نے جواب دیا۔

”اس میں تو خدا نخواستہ نقصان کا امکان ہی نہیں ہے میں حاضر ہوں۔“

وہ۔ ”نہیں بھائی صاحب یہ کہیے کہ فائدہ کا امکان نہیں ہے اس لیے کہ ہماری دیکھی دیکھی اور لوگ بھی ڈاک خانہ ضرور کھولیں گے اور جب بہت سے ڈاک خانے ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ ہم کو وہ آمدنی نہیں ہو سکتی جو اب ہے مگر اللہ مالک ہے۔

نفع نقصان تو کاروبار میں لگا ہی رہتا ہے بھائی، اگر دوسرے ڈاک خانوں نے پیرس کا ٹکٹ بیچا تو ہم کو پیرس کے دو بیچنا پڑیں گے اسی مقابلہ کا تو ڈر ہے مگر دیکھیں

ہم سے سنا کون بیچتا ہے۔ ہم تمام بازار سے اپنا بھاؤ گرا دیں گے۔

ہم نے پھر حیرت سے پوچھا۔ ”کیا فرمایا، اور لوگ بھی کھول سکتے ہیں ڈاک خانہ؟“

وہ۔ ”کیوں بھائی کیا اکیلے ہم ہی آدمی ہیں کھول کیوں نہیں سکتے اور دیکھئے گا سینکڑوں کھولیں گے۔“

ہم ایک سناٹے میں آگئے لیکن اب ان حضرات سے کیا کہتے۔ مجبوراً چپ رہے اور ان سے کہہ دیا کہ:-

”اچھا ہم کام کرتے ہیں، بتائیے کیا کریں۔“

وہ۔ ”میں تو حساب لگاتا ہوں اب تک کی آمدنی کا اور آپ یہ کہتے کہ لیزر بکس کھول کر سب خط نکال لیجئے اور جس پر انگریزی ٹکٹ لگا ہوا اس کو پھاڑ کر پھینک دیجئے، باقی اپنے ٹکٹوں کے خط جمع کر کے ان کو الگ الگ کر لیجئے کہ کس شہر کا کون ہے اور یہ بھی دیکھتے رہیے گا کہ اگر کوئی آدمی، منی آرڈر وغیرہ لائے تو لے لیجئے گا، اور پارسل بھی۔ دام آپ خود چکا لیجئے گا ہاں اگر کوئی تار دینے آیا کرے تو کہہ دیجیے کہ تار نہیں ہے۔“

ہم نے پوسٹ ماسٹر صاحب کی تمام ہدایتوں پر عمل کرنا شروع دیا اور ہمارے ساتھ ان کے وہ بھانجے جن کو شام تک سب پوسٹ ماسٹر ہو جانے کی امید تھی مصروف کار ہو گئے۔ ہم نے سینکڑوں انگریزی ٹکٹ کے خط پھاڑ ڈالے اور اپنی مہر والے ٹکٹ کے تمام خطوط یکجا کر کے شہر وار تقسیم کر ڈالے۔ اس کے بعد سب کے دام جوڑ ڈالے۔ لیکن یہ کام سب سے زیادہ مشکل تھا اس لیے کہ اس میزان کل کو پوسٹ ماسٹر صاحب کی میزان سے مطابقت کرنا اسکوئی لونڈوں کی طرح کھیل نہ تھا اس کے لیے بڑا ریاضی داں ہونا چاہیے، لیکن ہم نے جلدی سے پوسٹ ماسٹر صاحب کی

میزان کل دیکھ کر اسی کے مطابق یہ میزان بھی بتادی۔ اب گویا ہم کو چھٹی تھی اور ہم آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب بھی کرسی پر سر رکھے سو رہے تھے اور ان کے بھانجے صاحب بھی نہیں گھومنے گئے تھے لہذا ہم خاموش بیٹھے رہے۔ اتنے میں ایک صاحب تھیلی میں کچھ روپے لیے ہوئے تشریف لائے اور ہم سے منی آرڈر کرنے کو کہا۔ ہم نے روپے پورے دو سو دس گن لیے اور ان سے کہا۔ ”بس جائیے۔“

انھوں نے کہا۔ ”اور رسید؟“

ہم نے مہر لگا کر ایک رسید بھی دے دی۔ وہ بے چارے رسید لے کر چل دیئے اور وہ کاغذ ہم کو دے گئے جس پر فریسنده اور یابنده دونوں کے نام اور پتہ لکھے ہوئے تھے۔ ہم ابھی اس کاغذ کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک اور صاحب تشریف لائے اور ہم سے پوچھا۔

”کیوں صاحب ہمارے نام کوئی منی آرڈر آیا ہے؟“

ہم۔ ”آپ کا نام؟“

وہ۔ ”بلد یو پرشاد کھرے۔“

ہم۔ ”پتہ؟“

وہ۔ ”ترمنی گنج لکھنؤ۔“

ہم نے اس کاغذ کو دیکھ کر جواب دیا۔ ”آپ کے نام کا تو کوئی منی آرڈر نہیں ہے۔ ایک منی آرڈر بلد یو سہائے کہا پڑے کے نام کا ہے۔“

وہ۔ ”اجی وہ میرا ہی ہوگا۔ نام غلط لکھ دیا گیا ہے۔ کتنے کا ہے؟“

ہم۔ ”دو سو دس کا ہے۔“

وہ۔ ”جی ہاں جی ہاں دو سو دس ہی کا تھا، لائیے وہ میرا ہے۔“

ہم۔ ”لیکن یہ کانپور کا ہے۔“

وہ۔ ”جی ہاں، میں کانپور سے آج ہی آیا ہوں، وہ میرا ہی ہے۔“

ہم۔ ”تو آپ سردار احمد صاحب کو بلا لیجیے جنھوں نے منی آرڈر بھیجا ہے وہ کہہ دیں تو میں ابھی دے دوں۔“

وہ۔ ”اجی تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ کانپور بھیجیں گے اور وہاں سے واپس آجائے گا۔ اس طوالت سے کیا فائدہ جب میں یہیں موجود ہوں تو مجھے ہی دے دیجیے نا۔“

ہم نے تھوڑی دیر تک تمام نشیب و فراز پر غور کرنے کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ منی آرڈر کے روپے ان کو دے دیں اور ان کے دستخط لے لیں لہذا ہم نے ان سے دستخط کرا لیے اور روپے ان کے حوالے کر دیئے۔

وہ سلام کر کے چل دیے اور ہم نے اطمینان کی سانس لی کہ ایک جھگڑا تو چکایا لہذا منی آرڈر کی رسید اور یابنده کے دستخط دونوں لے کر رکھ لیے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کے بیدار ہونے کے بعد ہم نے منی آرڈر کی رسید اور یابنده کی دستخط دونوں ان کے سامنے پیش کر دیئے جن کو دیکھتے ہی پوسٹ ماسٹر صاحب ہکا بکا ہو کر بولے۔ ”یہ کیا؟“

ہم نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”ایک صاحب نے منی آرڈر کیا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جن کے نام منی آرڈر تھا وہ خود آگئے اور میں نے پوری تحقیقات کرنے کے بعد ان کو روپے دے دیئے اور دستخط لے لیے۔“

پوسٹ ماسٹر۔ ”ارے بھائی کیا بک رہے ہو منی آرڈر کانپور کا تھا یہاں کیسے دے دیا۔؟“

ہم۔ ”جی ہاں انھوں نے کہا کہ میں ابھی کانپور سے آ رہا ہوں۔“

پوسٹ ماسٹر۔ ”اور ان کا نام تو بلد یو سہائے کھا پڑ دے لکھا ہے اور منی آرڈر بلد یو پر شاد کبر ہے؟“

ہم۔ ”جی ہاں جی ہاں اس کے لیے بھی انھوں نے کہا کہ نام اتفاق سے ذرا سا غلط ہو گیا ہے۔“

پوسٹ ماسٹر۔ ”یار تم نے بڑا غضب کیا، نہیں معلوم کون تم سے روپیہ اینٹھ لے گیا۔ تم سے دینے کو کس نے کہا تھا میں نے تو صرف لینے کو کہا تھا۔“

ہم۔ ”یہ کیا جناب روپیہ لیا تو جائے اور دیا نہ جائے میں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔“

وہ۔ ”جی ہاں آپ نے تو فرض ادا کر دیا اب اگر بھیجئے والا آ کر اپنے روپیہ کا مطالبہ کرے تو کیا ہوگا؟“

ہم۔ ”ہوگا کیا؟ اس نے جس کو بھیجا تھا اس کو دے دیا گیا؟“
وہ۔ ”دیکھئے اس قسم کی باتوں سے شک پیدا ہو جاتا ہے اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آپ ہی پر شبہ کرتا۔“

ہم۔ ”یہ آپ نے اچھی کہی آپ مجھ کو چور بناتے ہیں، جناب بس بخشنے مجھے، میں باز آیا۔ آپ میری تلاشی لے لیجئے۔“

وہ۔ ”جناب آپ مجھ پر آنکھیں تو نکالے نہیں میں نے آپ کے ایسے بہت سے میاں لوگوں کو آڑ مالیا ہے۔“

ہم۔ ”کیا کہتے ہو، ایک شریف آدمی سے ایسی باتیں کرتے ہوئے تم کو ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔ خبردار اب زبان نہ کھلے۔“

وہ۔ ”ایک تو روپیہ دیا اس پر سے زبان چلاتے ہو یہی شرافت ہے۔“

ہم۔ ”تم نہیں مانو گے تو میں زبان کے بعد کچھ اور بھی جانتا ہوں۔“

وہ۔ ”یہ تو اچھی زبردستی ہے کہ روپیہ کا روپیہ لے لیا اور غصہ الگ کر رہے ہیں۔“

ہم اور وہ دونوں دست و گریباں ہونا ہی چاہتے تھے کہ ہمارے کان ”خط لے جائیے“ کی آواز سے گونج گئے اور اس طلسم تخیل کے نوٹے ہی ہم نے اپنے کو چار پائی سے اٹھ کر پوسٹ مین کی طرف جھپٹتے ہوئے پایا۔ بھائی زیر کا خط جس کا انتظار تھا آ گیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بھگواند سب خیریت ہے اور آپ کی خیر و عافیت درگاہ خداوند کریم سے نیک مطلوب۔

